ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

اندر کی باتیں (افسانے)

اندر کی باتیں

(افسانے)
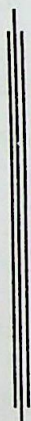
ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

نوٹ: افسانوں کے اس مجموعے کے تمام کردار وواقعات فرضی ہیں۔

ANDAR KI BATEIN

(Short Stories)

by

Dr. Mushtaq Ahmed Wani

Year of Edition Sep. 2015
ISBN 978-93-5073-707-1
₹ 350/- (Library Edition)

نام کتاب	:	اندر کی باتیں (افسانے)
مصنف	:	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
سنہ اشاعت	:	ستمبر ۲۰۱۵ء
قیمت	:	۳۵۰ روپے (لائبریری ایڈیشن)
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

★ ممتاز فکشن نگار محترم جناب **انتظار حسین** صاحب کے نام

★ عالمی شہرت یافتہ محقق، نقاد اور ماہر لسانیات محترم و مکرم
جناب **پروفیسر گوپی چند نارنگ** صاحب کے نام

اور

★ اپنے محترم و مکرم استاد جناب **پروفیسر ظہور الدّین** صاحب کے نام
جنہیں، اس بات کا شدید دُکھ ہے کہ لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی!

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
Dr. Mushtaq Ahmed Wani
Lane No.3, House No.7
Firdousabad Sunjwan
Jammu Tawi-180011
Mobile No. 09419336120 (BSNL), 07 298440737 (Aircel)
E-mail: drmushtaqahmedwani@gmail.com
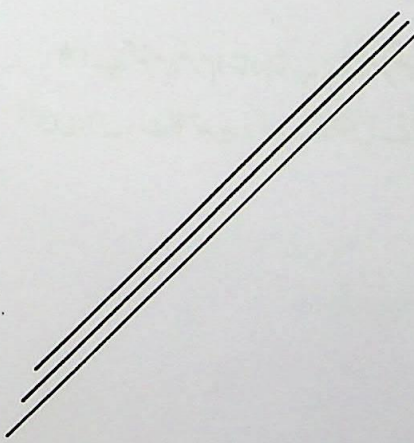
اظہار تشکر

اس کتاب کی اشاعت میں
جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ
لینگویجز کا جزوی مالی تعاون شامل ہے جس
کے لیے مصنف اکیڈمی کا تہہ دل سے مشکور
وممنون ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ترتیب

افسانے

■❖■

کشمیری لال ذاکر (چندی گڑھ)
09356094596

مجھے بس اتنا ہی کہنا ہے

جب بھی کوئی نیا تخلیق کار آسمان ادب پر ابھرتا ہے تو مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک نیا ستارہ ایک نئی روشنی اور ایک نئی بشارت لے کر آیا ہے۔ میں اس کے حق میں سلامتی کی دعا کرتا ہوں اور اس کے استقبال کے لیے اپنے گھر میں ایک نئی شمع جلاتا ہوں۔

جب کوئی ایسا واقعہ میرے وطن جموں وکشمیر میں تشکیل پاتا ہے تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک بھرے پُرے گلستان میں ایک اور گلاب کھلا ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ اس روز جب پریم ناتھ پردیسی کا پہلا افسانہ 'ساقی' میں شائع ہوا تھا تو مجھے کتنا سکون ملا تھا۔ میں نے پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، ٹھاکر پونچھی اور ان کے بعد پشکر ناتھ، نور شاہ، نرسنگھ داس نرگس، موہن یاور، ہری سنگھ پرویش اپنی تخلیقات لے کر میدان ادب میں آئے اور نئے گل بوٹے کھلا کر ریاست جموں وکشمیر کے ادب کو مالا مال کیا تو مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ مجھے کچھ اور لکھنے والوں کی تخلیقات کو پڑھنے کا بھی موقع ملا ہے جن میں دیپک بدکی، ترنم ریاض، زنفر کھوکھر اور کچھ دوسرے افسانہ نگاروں کو بھی پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ جناب مشتاق مہدی، غلام نبی شاہد، عبدالغنی شیخ، عبدالرشید لداخی، نذیر جوہر، ریاض توحیدی، فلک ریاض اور انیس عادل شامل ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ میں کچھ ذاتی اور سیاسی حالات سے سمجھوتہ نہ کر سکا اور ۱۹۴۳

میں لاہور آ گیا اور ترقی پسند ادیبوں کے قافلے میں شریک ہو گیا اور اس وقت کے سبھی مشہور ادبی رسائل، ہمایوں، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، نقوش، سویرا، میں لکھتا رہا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے آپ کو اپنے وطن کے ادیبوں اور فنکاروں سے جوڑے رکھا اور ایک وقت ایسا آ گیا جب میرے پڑھنے والوں اور میرے ادیب دوستوں نے میرے متعلق یہ رائے قائم کر لی کہ میں اپنے وطن سے دور رہ کر بھی اس سے اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو جوڑنے کے لئے ایک پل کا کام کر رہا ہوں۔ میں آج جب مشتاق احمد وانی کی کہانیوں کو پڑھ رہا ہوں کہ میرے وطن کے آسمان پر ایک اور روشن ستارہ اپنی تابانیوں کے ساتھ طلوع ہو رہا ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس کا استقبال کرتا ہوں اور اس کی سلامتی کی دعا کرتا ہوں۔

اس سے پہلے مجھے وانی کی کتاب 'اردو ادب میں تانیثیت' کو بھی پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا تحقیقی کام ہے۔ اس کے لئے اسے مبارک پیش کرتا ہوں۔

خدا کرے وہ اپنے پڑھنے والوں کو اپنی تخلیقات سے مالا مال کرتا رہے۔

■❖■

پروفیسر قدوس جاوید
(سابق صدر شعبۂ اُردو سینٹرل، یونیورسٹی، کشمیر)
09419010472

مشتاق وانی کا افسانہ ''اندر کی باتیں''

(ایک آتش فشاں)

معاصر اُردو ادب میں مشتاق وانی ایک مانوس قلمکار کا نام ہے۔ تخلیق، تحقیق اور تنقید کو یکساں طور پر ایک معیار کے ساتھ برتنا آسان نہیں۔ لیکن مشتاق وانی ایسا کر گزرتے ہیں۔ اس سے اُن کی ہمہ جہت ادبی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے اُن کی مفصّل تصنیف اُن کے وسیع و عمیق مبلغ علم کا تازہ ثبوت ہے۔ فکشن کی تنقید اُن کی تنقیدی سرگرمیوں کا نمایاں پہلو تو ہے ہی، لیکن ساتھ ہی ایک منفرد فکشن نگار کی حیثیت سے بھی مشتاق وانی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ اُن کے کئی افسانے ہیں جو انہیں معاصر افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں جگہ دلوانے کی ضمانت ہیں۔ لیکن ان کا افسانہ ''اندر کی باتیں'' کئی اعتبار سے ایک عمدہ مابعد جدید افسانہ کہلانے کا سزاوار ثابت ہوتا ہے۔

مابعد جدید افسانہ میں بنیادی فکر، خیال یا موضوع، افسانہ کے مرکز میں پاؤں تو جمائے رکھتا ہے کہ یہ افسانے کا فنی تقاضہ ہے لیکن ساتھ ہی موضوع کے دائرے اور لکیریں، تجربات و محسوسات کے طور پر پورے افسانہ کے اندر اور باہر حاشیوں پر بھی پھیلے ہوتے ہیں اور آخر کار افسانہ کو ایسے موڑ پر پہنچا دیتے ہیں جس کے آگے کیفیت و تاثر کی ان گنت

صورتیں بنتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ قاری اس موڑ پر پہنچ کر کیفیت و تاثر کی کس راہ پر گامزن ہوگا اس کا فیصلہ کرنے کا مجاز قاری خود ہوتا ہے۔

افسانہ ''اندر کی باتیں'' ملک کے تعلیمی نظام میں پھیلی بدعوانی کو بے نقاب کرتا ہے، مفاد پرست سلیکشن کمیٹیوں کے ارکان اور سینئر پروفیسروں کی ضمیر فروشیوں کا پردہ چاک کرتا ہے اور ساتھ ہی علم و دانش کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے جینوین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل اُمیدواروں کے ساتھ روا رکھی جانے والی بے انصافیوں کو بھی سامنے لاتا ہے۔

ہندوستان کے تعلیمی نظام میں چترنجن باسو جیسے پروفیسروں کی تعداد دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ایسے پروفیسران نہ صرف خود توڑ کر کے پروفیسر جیسے مقدس منصب پر قابض ہوجاتے ہیں بلکہ دولت، عورت اور شراب کی ہوس میں ناعاقبت اندیش، نام نہاد ممتحنوں (Experts) کے ساتھ سازباز کر کے نالائق اور نااہل امیدواروں کو منتخب کروانے میں کامیاب بھی جاتے ہیں۔ افسانہ کا مرکزی کردار کمل کانت ایک استعارہ ہے۔ اُن سینکڑوں ہزاروں غیر معمولی دانشور اساتذہ کا جنہیں یونیورسٹیوں میں آنے سے روکا جاتا ہے۔ جبکہ خیالو رام اُن اساتذہ کی نمائندگی کرتا ہے جو علم و آگہی کے اعتبار سے تو کھوکھلے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں (یونیورسٹیوں) میں من چاہا منصب حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ سارے کے سارے ممتحن (Experts) بے ایمان اور ضمیر فروش ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں علم دوست اور صلاحیتوں کے قدرداں پروفیسروں کی کمی نہیں لیکن یہ دوسری بات ہے کہ جب سلیکشن کمیٹی میں حق بہ حقدار رسید کا مرحلہ آتا ہے تو وہ احتجاج یا کم از کم ناراضگی کا اظہار کرنے کی بھی جسارت نہیں کر پاتے ہیں۔ چترنجن باسو جب انٹرویو کے ایک ایکسپرٹ سے کمل کانت کو ریجیکٹ اور خیالو رام کو سلیکٹ کرنے کی بات کرتا ہے تو پرفیسر کلدیپ سنگھ تلملا اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

''باسُو صاحب! مجھے آپ سے یہ اُمید نہ تھی کہ آپ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنے کا مزاج رکھتے ہیں اور مجھے بھی ایسا ہی کہنے پر مجبور کریں گے۔ میں جہاں کہیں بھی آج تک

سلیکشن کمیٹی میں گیا ہوں تو میں نے حقدار کو اس کا حق دلایا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ خیالو رام کو اس انٹرویو میں آگے لانا چاہتے ہیں اور کمل کانت کو پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں تو یہ آپ اس پہ ظلم کر رہے ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ کمل کانت کی کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، تاریخ کے دقیق موضوعات پہ اُس کی تحقیق نے نئی جہات مرتب کی ہیں۔ اُس کی زبان اُس کے موضوعات اور اُس کی علمی بصیرت کا باسو صاحب میں بہت قائل ہوں۔ یہ وہی کمل کانت ہے جس کے تاریخی مضامین نہ صرف ہندوستان میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، کنیڈا، اٹلی، جرمنی، ناروے، ابوظہبی، برطانیہ، یورپ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی داد و تحسین وصول کرتے ہیں"۔

لیکن جب انٹرویو میں کمل کانے سے بے سر پیر کے سوالات کئے جاتے ہیں اور انہیں ریجیکٹ کر دیا جاتا ہے تو پروفیسر کلدیپ سنگھ کو اتنی جرات نہیں ہوتی کہ وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے خیالو رام جیسے لوگوں میں وہ کونسی خوبیاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر انہیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پروفیسر شپ مل جاتی ہے اس کا اندازہ چترنجن باسو کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جو وہ نریش رانا صاحب کے سامنے خیالا لو رام کی صفات کے بارے میں ادا کرتا ہے۔:

"نریش رانا صاحب میرے پاپوش کے تسمے کھولنے اور باندھنے سے لے کر میرے مکان میں پوچھ پھیرنے تک وہ کون سا ایسا کام ہے جو خیالو رام نے نہیں کیا ہے۔ اب آپ ہی بتائے میں اس کا خیال نہ رکھوں تو کس کا رکھوں اور پھر اتنی ہی بات نہیں ہے بلکہ اُس نے تو اپنی جمع پونجی بھی میرے نام بینک اکاؤنٹ میں جمع کروادی ہے اب آپ ہی کہئے کیسے انکار کروں۔"

مشتاق وانی نے افسانہ "اندر کی باتیں" میں یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی ہے کہ صارفیتی تہذیب کے زیر اثر چند لوگوں نے "پروفیسری" کو بھی ایک منفعت بخش کاروبار بنا لیا ہے۔ کئی اداروں میں ارباب حل وعقد کو اس کا علم بھی ہوتا ہے پھر بھی وہ آنکھیں بند کئے رہتے ہیں۔ اس سچائی کی جانب نریش رانا کی زبانی ان الفاظ میں اُنگلی اُٹھائی گئی ہے۔

"کمل کانت؟ جب دکاندار اپنے گاہک کو ماچس کی ڈبیاں یا صابن کی ٹکیہ مفت میں

نہیں دیتا ہے تو تجھے کیا اتنی بڑی اسسٹنٹ پروفیسری محض تیری ذہانت، اور قابلیت کی بنیاد پہ مل جاتی! تجھے پتا ہونا چاہئے دو لاکھ روپے سے یہ سودا شروع ہوا تھا اور پانچ لاکھ پہ ختم ہوا ہے۔"

مشتاق وانی نے بڑی جرات مندی سے کام لیتے ہوئے دارالعلوم کے سربراہوں پر بھی طنز کیا ہے۔ کمل کانت نریش رانا کے ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت ایک بادشاہ کی سی ہوتی ہے وہ چاہئے تو چھوٹے ملازموں سے لے کر بڑے ملازموں تک سب سے رات بھر کھڑے کھڑے کام لے سکتا ہے اور چاہئے تو دن کو انہیں آرام کروا سکتا ہے۔ دارالعلوم کے کسی انٹرویو میں اگر وہ اڑ جائے تو مستحق اُمیدوار کو حق دلائے بغیر نہیں رہتا۔ اس صورت میں منتری سے لے کر پردھان منتری تک کی تمام سفارشیں دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کی رہائش گاہ کی دیواروں سے سر ٹکراتی ہوئی اس کے کوڑے دان میں منہ کے بل گر جاتی ہیں لیکن اس بار اس کی حیثیت ایک ڈراما بیں سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی، یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے چترنجن باسو نے اُسے پہلے ہی گدگدی کر کے ہنسا لیا ہو"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا ملک بھی گلوبلائزیشن اور صارفیتی تہذیب (Consumer Culture) کی زد میں ہے۔ ہر شخص کسی بھی معاملے کو نفع اور نقصان کے زاویے سے شکم کی آنکھوں سے دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا ہے۔ انصاف پسندی پر ہوس پرستی غالب آتی جا رہی ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ سیاست ہو یا ثقافت، اقتصادیات ہو یا تعلیم کا میدان، ہر جگہ سطحیت اور میڈیوکریسی کا دور دورہ بڑھتا ہی جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں "خدا پرستی" باقی ہے۔ یہ ایمان کہ خدا بہر حال بندوں کو اس کے اعمال کی سزا یا جزا ضروری دیتا ہے۔ ابھی بھی ہمارے اخلاقی نظام کا لازمی جزو ہے۔ مشتاق وانی کے افسانہ "اندر کی باتیں" کا عبرتناک اختتامیہ اسی ایمانی شان وشکوہ کا اشاریہ ہے۔

"جب کمل کانت اپنے گھر پر پہنچا تو اس نے ایک مخصوص وقت پر اکیس (۲۱) دن تک جاپ کیا۔ ایک وقت کا کھانا کھایا۔ گھر کے گوشۂ تنہائی میں نہ جانے وہ بھگوان سے کیا کچھ مانگتا رہا۔ بالآخر اس کی آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کو بھگوان کے دربار میں شرفِ قبولیت حاصل ہو گیا۔ ادھر کمل کانت کا جاپ پورا ہوا۔ ادھر چترنجن باسو کے ہاتھوں اور

پیروں میں بے حسی پیدا ہوگئی جو مسلسل بڑھتی چلی گئی اور پھر جب وہ شہر کے مشہور ماہر امراض ڈاکٹر یوگیشور کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے اسے بڑے دکھی لہجے میں کہا۔

''باسو صاحب! آپ کے جسم میں کوڑھ کی بیماری نے ڈیرہ ڈال دیا ہے''

اس افسانے کی ساخت ایسی ہے کہ جو لوگ مشتاق وانی کی شخصیت اور صلاحیتوں سے واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ دوسرے سینکڑوں لوگوں کی طرح اُن کے ساتھ بھی کیسی کیسی بے انصافیاں ہوئی ہیں۔ تو عین ممکن ہے کہ ان کے اس افسانے کے بیانیہ کو ''جگ بیتی'' سے زیادہ ''آپ بیتی'' تصور کیا جائے۔

مشتاق وانی کو افسانہ بننے کا فن آتا ہے۔ بیانیہ (Narration) کو برتنا جانتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ کہاں کیا نہیں لکھنا چاہئے۔ افسانہ ''اندر کی باتیں'' محض افسانہ نگار کے داخلی جذبات و احساسات کا اظہار ہی نہیں۔ مشتاق وانی کے وجود کے اندر کا آتش فشاں ہے جو پھوٹ کر افسانے کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ ہمارے ادب کو، معاشرے کو ایسے ادب کی ضرورت ہے۔

■❖■

پروفیسر قاضی عبدالرحمن ہاشمی، دہلی
09990893596

تخلیقی زبان اور دلکش بیانیہ کا افسانہ نگار: مشتاق احمد وانی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ہمارے ان نوجوان ادیبوں میں ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور معیاری تحقیق وتنقید کی بدولت دنیائے ادب میں جموں وکشمیر کا نام روشن کیا ہے۔ وہ ایک تعمیری ذہن کے مالک اور مقصد آشنا تخلیق کار ہیں جو اپنے متعدد افسانوں کے ذریعہ یہ ثابت کر چکے ہیں کہ افسانہ نگاری نہ صرف ایک اہم سماجی ذمہ داری اور اخلاقی فریضہ ہے بلکہ یہ ہماری معاشرتی زندگی میں پھیلے ہوئے تمام تر شر وفساد، مکروفریب، ظلم وناانصافی اور جہل وتنگ نظری کے عفریت سے مسلسل برسرپیکار رہنے کا بھی ایک موثر وسیلہ ہے۔

وانی کے افسانے ان کی ذات سے شروع ہو کر انہیں پر ختم ہونے یا ان کی نجی زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں کی روئیداد ہونے کے بجائے اپنی ایک عمومی اور آفاقی جہت رکھتے ہیں جن میں پیش کردہ دکھ درد سے اکثر قاری اپنا رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ اس کا سبب ان کہانیوں کی موثر اور پرقوت تخلیقی زبان اور دلکش بیانیہ ہے۔

وانی نے اپنے ادبی مضامین خصوصاً اپنی تصنیف 'اردو ادب میں تانیثیت' کے ذریعہ ادبی، سماجی اور فلسفیانہ مسائل، خصوصاً عہد جدید میں خواتین کی ذہنی آزادی اور ان کو درپیش گوناگوں سیاسی، سماجی اور وجودی مسائل کو جس طرح سمجھا اور سمجھایا ہے وہ بھی نہایت قابل ستائش ہے۔ مجھے امید ہے کہ وانی کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'اندر کی باتیں' اپنے گہرے سماجی سروکار، بصیرت اور وافر مشاہدے کی بدولت قارئین کے ذہنوں پر دیرپا نقش چھوڑے گا۔

■❖■

پروفیسر مجید بیدار
(سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد)
09441097072

مشتاق احمد وانی

ایک سچے قلمکار اور تخلیقی حسیّت سے مالا مال افسانہ نگار

اظہار کی حقیقتیں عصر حاضر کا تقاضا ہے اور اس تقاضے کو محسوس کرتے ہوئے تخلیق کاروں نے حقیقت پسندی اور اس سے آگے کی باتوں کو تخلیقی حسیت کا وسیلہ بنایا ہے۔ اردو کی شعری دنیا میں غزل کو جس طرح کلی حیثیت حاصل ہے اسی طرح نثر میں افسانے کی صنف کو عالمی سطح پر سند کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ اردو افسانہ اور اس کے قلم کاروں نے زندگی کی ہر جہت کو تخلیق کا سہارا بنا کر ایسی دنیا آباد کی کہ جس پر بلاشبہ تخلیقیت کو بھی ناز ہو سکتا ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اردو افسانے کے بدلتے ہوئے تیور نے دنیا میں موجود نیرنگی کے پس پردہ استحصال اور گھناؤنی سازشوں کو بے نقاب کرنا شروع کیا۔ ہندوستان کی سرزمین سے اردو افسانے کی نمائندگی کرنے والے چند اہم تخلیق کاروں میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے کشمیر کی سرزمین سے آواز بلند کرتے ہوئے شعور کے کرب ہی نہیں بلکہ ذات کے کرب کو بھی اپنے افسانوں کا وسیلہ بنایا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک سچے قلم کار اور تخلیقی حسیت سے مالا مال ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے دنیا کی کڑوی حقیقتوں کی پیش کشی پر توجہ دی۔ وہ بیک وقت تخلیقی نثر کے قلم کار ہی نہیں بلکہ تحقیق

وتنقید کے علمبردار بھی ہیں۔اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور اب ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'اندر کی باتیں' منظر عام پر آرہا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اردو کے ان چند اہم افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے انسان کی ذات کو دروں بینی اور بیروں بینی حیثیت سے دیکھا ہے۔ تصوف کی زبان میں اس عمل کو ظاہر و باطن کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی افسانوں کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے والی تخلیقات کے ذریعہ کڑوی اور تلخ حقیقتوں کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔ فطری طور پر کچھ کریہی حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اظہار پر قلم کو روک لگانا ضروری ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی تہذیبی واخلاقی اقدار کی شکست سے برافروختہ ہیں اور ایسا برافروختہ تخلیق کار ہی اپنا مشہور افسانہ 'چھپا سانپ' لکھ سکتا ہے۔ ان کے بیشتر افسانے مختلف رسائل وجرائد میں نظرنواز ہوتے رہے ہے۔ اپنے افسانوی مجموعے 'اندر کی باتیں' کی اشاعت سے قبل ہی انہوں نے اس کتاب میں شامل بارہ[۱۲] افسانوں کے ۶ مسودات بھی روانہ کیے ان کے طرز تحریر اور فکر کی بلندی سے بلاشبہ اردو کا ہر قاری متاثر ہے۔ افسانے کو بیان کرنا اور اس کے توسط سے کہانی کو کشمکش سے ہم آہنگ کر کے انجام کی طرف لے جانا ان کے افسانوں کی بہت بڑی خوبی ہے۔ فطری آغاز اور بے ساختہ انجام ان کے افسانوں کی بہت بڑی خوبی ہے اور وہ اپنے افسانوں میں عصر حاضر کے مسائل کو پیش کرنے اور بگڑتے ہوئے سماج کی بے راہ روی کو نمایاں کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ 'اندر کی باتیں' جیسے افسانوی مجموعے میں شامل تمام بارہ افسانوں کا محاکمہ کیا جائے اور ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی افسانوی خصوصیت کو نمائندگی دی جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے کہانی کو تلاش کرنا اور کرداروں کو منضبط رویے کے توسط سے افسانے میں تخلیقیت کو نمایاں کرنا ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو خوب آتا ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مشاہدے کی قوت بہت تیز ہے۔ حساس دل کے مالک ہونے کی وجہ سے ان کی تحریریں حقائق سے مالامال اور اظہار کی خوبیوں سے علاقہ رکھتی ہیں۔ ان کے فن کی یہ خوبی بھی اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے چند ایک افسانوں کو چھوڑ کر اکثر افسانے انسانی فطرت کے عین مطابق

لکھے ہیں۔ ان کے افسانے اس قابل ہیں کہ انہیں کئی بار پڑھا جا سکے۔ تخلیقی حسیت کا نادر نمونہ ان کی تحریروں کا وصف ہے۔ وہ ہمیشہ جدت اور ندرت کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں نئی آگہی اور عصری حسیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ سماج کے دیگر موضوعات کی طرف توجہ دیتے ہوئے اگر وہ جنسی بے راہ روی کے موضوع سے فرار اختیار کریں تو بلاشبہ ان کی تحریر کا جادو اردو دنیا کو اپنے قبضے میں کر سکتا ہے۔ بلاشبہ جنس بھی زندگی کا ایک رویہ ہے لیکن کسی بھی رویے کو ذات اور شخصیت پر مسلط کر لینا مناسب نہیں۔ توازن ہی زندگی کا بہترین وصف ہے۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی عصری حقیقتوں کو بیان کرنے کے دوران سماج اور معاشرے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی فطری خصوصیت کو بھی ملحوظ رکھیں۔ غرض کشمیر کی سرزمین سے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے تیسرے افسانوی مجموعے 'اندر کی باتیں' کی اشاعت پر دلی مبارک باد دیتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ فہم و فراست کے نازک موتیوں کو اپنے اسلوب میں چھلکاتے ہوئے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے افسانہ نگاری کے ذریعے اپنی تخلیقی حسیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ توقع ہے ان کی تخلیقی کاوشوں کو اردو داں طبقہ قدر کی نگاہ سے دیکھے گا اور ان کے افسانے ہر ہندوستانی کے دل کی آواز بن کر سماج اور معاشرے میں تغیر و تبدل کا وسیلہ بن جائیں گے۔ میری نیک تمنائیں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانہ اور ان کی تخلیقی حسیت کے ساتھ شامل ہیں۔ توقع ہے کہ اردو داں طبقہ حقیقت پسندی کے اس اظہار پر ضرور توجہ دے گا۔

■❖■

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)
09430966156

مشتاق احمد وانی کی فنکارانہ بصیرت

'اندر کی باتیں' کے تناظر میں

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی پڑھے لکھے اور ذی فہم قلمکار ہیں۔ مشتاق احمد وانی نے تاریخ کے سبجیکٹ کے ایک انٹرویو کی تفصیل بیان کی ہے کہ چترنجن باسو جیسا انٹرویو بورڈ کا ممبر خیالو رام کو اسسٹنٹ پروفیسر بنانا چاہتا ہے جس کے بارے میں وہ خود بتاتا ہے۔

''میرے پاپوش کے تسمے کھولنے اور باندھنے سے لے کر میرے مکان میں پوچھ پھیرنے تک کون سا ایسا کام ہے جو خیالو رام نے نہیں کیا ہے اور پھر اتنی ہی بات نہیں ہے بلکہ اس نے تو اپنی جمع پونجی بھی میرے نام بینک اکاؤنٹ میں جمع کرادی ہے۔

میں نے پوچھا کتنی جمع پونجی؟

چترنجن باسو نے اپنے ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں میرے سامنے کھڑی کردیں''
...... پانچ لاکھ کے اس نوکر نما کنڈیڈیٹ کی بابت ایکسپرٹ سے چترجن باسو سفارش اس طرح سے کرتا ہے:

> ''اس کا انتخاب ہونا چاہئے۔ یہ ہسٹری میں ایم فل، پی ایچ ڈی ہے۔ نہایت شریف، دیانتدار اور محنتی ہے۔ اس لئے آپ نے اسے کل انٹرویو میں جو کچھ بھی پوچھنا ہے اسے وہ سب کچھ بتا دیجئے۔ کوشش کیجئے کہ اس کی تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم، والدین کا نام،

شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اور پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا؟ اس سے آگے سوالوں کا سلسلہ نہ بڑھے ورنہ اس شریف آدمی کی زبان لڑکھڑا کر رہ جائے گی۔"

خیالو رام کے مقابلے میں کمل کانت بھی ایک کنڈیڈیٹ ہے جس کے بارے میں سلیکشن کمیٹی کے ایک دوسرے ممبر اپنی رائے اس طرح پیش کرتے ہیں:

"آپ خیالو رام کو اس انٹرویو میں آگے لانا چاہتے ہیں اور کمل کانت کو پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں تو یہ آپ اس پر ظلم کر رہے ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ کمل کانت کی کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تاریخ کے دقیق موضوعات پر اس کی تحقیق نے کئی جہات مرتب کی ہیں۔ یہ وہی کمل کانت ہے جس کے تاریخی مضامین نہ صرف ہندوستان میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، کنیڈا، اٹلی، جرمنی، ناروے، ابوظہبی، برطانیہ، یورپ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی داد تحسین وصول کرتے ہیں۔"

چترنجن باسو پیر پکڑ لیتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں کہ خیالو رام کو ہی ترجیح دیں۔ تیسرے ممبر کو بھی وہ اسی طرح راضی کر لیتے ہیں۔ اور آخر کار انٹرویو کے لئے ماہرین تاریخ کے روبرو کمل کانت جب ہوتا ہے تو اس سے سوالات کئے جاتے ہیں:

(۱) "حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا سائز کیا تھا یعنی اس کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کتنی تھی؟

(۲) دنیا میں پہلے مرغی آئی یا انڈا؟

(۳) شاہجہاں اور ممتاز بیگم کی قبروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟

(۴) حشرالارض میں کون سا کیڑا سب سے پہلے گرمی کے موسم میں زمین کے اندر سے باہر آتا ہے اور کون سا کیڑا سردی کے موسم میں سب سے پہلے زمین کے اندر چلا جاتا ہے؟"

ظاہر ہے کمل کانت کسی سوال کا جواب نہیں دیتا اور خیالو رام کو ملازمت مل جاتی ہے۔

آج کے گلوبلائزیشن کے عہد میں افکار ونظریات میں انقلاب برپا ہے۔ لیکن تعلیمی قدر شناسی میں زیست کے اصول مرتب کرتے وقت استحصال، چاپلوسی اور روپے کی قدر و قیمت کو ہی فوقیت دی جاتی ہے جس سے شعور وآگہی اور بصیرت وبصارت مجروح ہو رہی ہے۔ اس سازشی المیہ سے جہاں سوچ کے دائرے سمٹتے جا رہے ہیں وہیں بغاوت کی چنگاری کو ہوا مل رہی ہے۔ کمل کانت جیسے ہونہار مایوسی کے عالم میں یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر دہشت گرد بن جاتے ہیں۔ حالانکہ اس افسانہ میں ایسا کچھ ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔

مشتاق احمد وانی نے جس آئینہ کا عکس پیش کیا ہے اس میں سماجی اور معاشرتی نظریات کی سچائی برعکس ہے۔ حقیقت کی اہمیت وہی ہے جو اس افسانہ میں ہے جو اس افسانہ میں ہے۔ حاشیے پر کھڑے لوگ محض تماش بین ہیں۔ دائرے میں محدود وقت مصلح نہیں ہے۔ صحت مند عمل سے کوئی آشنا نہیں ہے۔ چہرے پر اضطراب زمان ومکان کے گزرتے لمحے کی ناانصافی کو نشان زد کرتا ہے لیکن معنویت عصری تصویر میں گم ہے۔ عدم مساوات، ظلم وجبر، تعصب پرستی، بے ایمانی، تنگ نظری اور تنگ ذہنی کی تاریکی ہر زمانے میں کم وبیش رہی ہے لیکن اکیسویں صدی کے گزرتے ماہ وسال میں یہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ تخلیقی شناخت میں صرف کشمکش ہے، حال کے اندیشے میں کسک اور کسک ہے۔ ایسے میں یخ بستہ سماج کی کجروی اور زہرناکی دیرپا ثابت ہو رہی ہے جس کی جڑیں بدلتے نقشے کی نقاب کشائی نہیں کرتیں بلکہ استحصال کے محور کی آئینہ دار ہیں۔ کمل کانت جیسے تاریخ سے واقفیت رکھنے والے فنکار کو دم توڑتی انسانیت کے گھناونے پن سے بکھراؤ ملتا ہے۔ اسے ناانصافی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ پاؤں پھیلاتی تعلیمی برائیوں کو دیکھ کر اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا جاتا ہے اور سفید پوش طبقہ کے چلن پر کڑھتا ہے۔ یہ افسانہ قاری کو جھنجھوڑنے کا شعور رکھتا ہے۔

مشتاق احمد وانی کی فنکارانہ بصیرت اور موضوع کے تنوع کی وجہ سے، جذبات واحساسات کو اعمال کے منفرد انداز اور وژن کی کرشمہ سازی کی بنا پر یہ افسانہ الگ جہتیں رکھتا ہے، عصری حسیت کی نباضی کرتا ہے۔ تہہ بہ تہہ رمزیت وایمائیت کے گراف تک لے جاتا ہے اور بے کردار اجتماعی زندگی کو پہچان عطا کرتا ہے۔ عصری مسئلے کی اس لہر میں دائرے کو محیط کرنے کی قوت ہے۔ جذبے کی زبان میں لکھی یہ کہانی درد سے بھری ہوئی ہے۔

■❖■

پروفیسر ابوالکلام
صدر شعبہ اُردو مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدر آباد
09866365003

مشتاق احمد وانی

موضوعاتی نُدرت وجدت اور فنی نفاست کا افسانہ نگار

مشتاق احمد وانی ۳؍مارچ ۱۹۶۰ء کو ریاست جموں وکشمیر، ضلع ڈوڈہ، بہوتہ گاؤں کے سروال محلے میں پیدا ہوئے۔ ادبی دنیا میں انہیں ایک اہم افسانہ نگار، محقق اور ناقد کی حیثیت سے جانا و پہچانا جاتا ہے۔ تعلیم وتربیت اور معاشرے کا گہرا مطالعہ ومشاہدہ انہیں ایک ادبی پہچان عطا کرتے ہیں۔ تخلیق، تحقیق اور تنقید کے مختلف موضوعات پر ان کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جنہیں جموں وکشمیر، مہاراشٹر اور اتر پردیش کی اکادمیوں سے اعزازات بھی حاصل ہوئے ہیں۔ جموں یونیورسٹی نے 'مشتاق احمد وانی بحیثیت افسانہ نگار' کے موضوع پر ایم فل کی ڈگری تفویض کی ہے۔

مشتاق احمد وانی ایک حساس طبیعت اور ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ اردو افسانے کی شاندار روایت کو آگے بڑھانے میں ان کی افسانہ نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ زیر نظر افسانوی مجموعے سے قبل دو اور مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا یہ تیسرا مجموعہ 'اندر کی باتیں' جملہ بارہ افسانوں پر محیط ہے، جن میں 'اندر کی باتیں'، 'جسم خور کیڑا'، 'باغی'، 'چھپا سانپ'، 'بابا کو کچھ ہو گیا ہے'، 'ایک اہم سوال'، 'فتنہ'، 'چہرہ چھپائے لوگ'، 'باہر اور اندر کا

منظر'، 'پانچ سال کا بن باس' 'آنکھوں کی عصمت دری'، 'سرگوشی' شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل تمام افسانے ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

افسانوی مجموعہ 'اندر کی باتیں' میں شامل سبھی افسانے سماج کے مختلف مسائل کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان افسانوں کے موضوعات میں ندرت وجدت کا پہلو نمایاں ہے۔ چھوٹے اور اچھوتے موضوعات کو افسانوی رنگ دینا اور قاری تک اپنے خیالات و احساسات کو پہچانا مشتاق احمد وانی کی خاص بات ہے۔ ان کے افسانے 'اندر کی باتیں' میں سماج میں موجود کرپشن، رشوت خوری، سیاسی چالبازیوں اور ایک بے روزگار نوجوان کی کیفیت اور اس میں جنم لینے والے برے خیالات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ 'جسم خور کیڑا' میں دنیا کی بے ثباتی اور انسانی جسم کی اصلیت اور معاشرے میں اقدار کی پامالی کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ افسانہ 'فتنہ' میں سماج کے افراد کے احمقانہ برتاؤ پر طنز ہے۔ افسانہ 'سرگوشی' میں نئی نسل کی ناپائیدار محبت اور مکر وفریب کو موضوع بنایا ہے۔ 'بابا کو کچھ ہو گیا ہے' افسانے میں دھرم کے ٹھیکیداروں کی اصلیت کو واضح کیا ہے۔ 'چھپا سانپ' میں ایک عورت کی بے بسی اور ایک مرد کی وحشیانہ حرکت کو دکھانے کی کوشش کی ہے، جس میں ایک عورت کا اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ ہونے اور سماجی قدر ورشتے کی پامالی کو موضوع بنایا ہے۔

مشتاق احمد وانی کے افسانے اپنے فن اور موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ سادہ ہیں۔ موضوعات عام اور روزمرہ کی زندگی سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ان عام فہم موضوعات میں افسانویت پیدا کرنا اور انہیں فن پارے کا روپ دینا ایک ماہر فنکار کا ہی کام ہوتا ہے۔ جس میں مشتاق احمد وانی کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے منتخب کردہ موضوعات عام طور پر بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان موضوعات کو لوگوں نے غیر ضروری سمجھا۔ مشتاق احمد وانی نے ان غیر ضروری موضوعات میں بھی ضرورت کی چیز ڈھونڈھ نکالی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں سماج کی برائیاں دور کرنے اور ایک بہتر معاشرے کی تشکیل کے خواہاں ہیں۔ وہ معاشرے میں انسان دوستی، اخوت، مساوات، اقدار کی پاسداری، قومی یکجہتی کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں کے موضوعات کی بنیاد انہیں مقاصد پر منحصر ہے۔

مشتاق احمد وانی کے یہاں افسانوں میں کرداروں کا انتخاب بھی مناسب ومتوازن دکھائی دیتا ہے۔ وہ واقعے کے عین مطابق کردار کا تعین کرتے ہیں۔ ان کے کردار مختلف سماجی، تہذیبی اور مذہبی گروپ سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ سبھی کردار اپنی خصوصیات کے ساتھ افسانے میں داخل ہوتے ہیں اور افسانوی فضا پر چھا جاتے ہیں۔ افسانے میں واقعات کے زیر سایہ رونما ہونے والے مناظر ایک خاص فضا قائم کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کہانی پن پایا جاتا ہے۔ افسانے کے واقعات کی تفہیم میں قاری کو زیادہ الجھنا نہیں پڑتا، قاری پڑھتا جاتا ہے اور واقعات منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ قاری کی دلچسپی کو قائم رکھنے میں افسانہ نگار بڑی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔

مشتاق احمد وانی کے افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے لیکن کہیں کہیں پر اچھے اور بہترین جملوں میں ثقیل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، جو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کرداروں کے سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی سیاق میں زبان کا استعمال کیا ہے۔

مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں سماج کی اصلاح وفلاح کا پہلو مضمر ہے۔ وہ قوم وملت کی ترقی، قومی یکجہتی، باہمی مساوات اور اخوت کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ مشتاق احمد وانی نے اپنے فسانوں میں ان سبھی موضوعات کو سمویا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ سماج اور معاشرے میں تبدیلی کا باعث ہوگا نیز جسے ادبی سماجیات کے تفہیمی عمل کے لئے آلہ کار کے طور پر لیا جائے گا۔ میری نیک خواہشات اور تمنائیں۔

■❖■

پروفیسر ابوالکلام قاسمی
(مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ)
09456241142

افسانہ نگار مشتاق احمد وانی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ادب کے ایک سنجیدہ قاری اور ادیب ہیں۔ انہوں نے یوں تو متعدد عمدہ افسانے بھی لکھے ہیں مگر اپنا زیادہ گہرا نقش تنقید نگاری میں قائم کیا ہے۔ یہ اتفاق بہت ہی عام ہے کہ ایک سے زیادہ اصناف ادب سے سروکار رکھنے والے ادیب کسی خاص صنف کے ساتھ مکمل انصاف نہیں کر پاتے۔ تاہم مشتاق احمد وانی نے افسانوی تخلیقات میں اپنے تنقیدی شعور کو بھی استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے وہ تنقید میں اپنے ناقدانہ شعور کو روبہ عمل لاتے ہیں اور افسانہ نگاری میں افسانے کے فنی لوازم کا خیال رکھتے ہوئے اپنے اسی شعور کو رہنما بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب جبکہ ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ اشاعت کے مراحل میں ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ متعدد افسانوں کی تخلیق کے عمل سے گزرنے کے بعد افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی کارکردگی پر راقم الحروف ایک نگاہ ڈالنا لازمی سمجھتا ہے۔ اس مجموعہ کا نام 'اندر کی باتیں' رکھا گیا ہے جو مصنف کے ایک افسانے کا عنوان بھی ہے۔ اس عنوان میں اگر کسی قدر سنسنی خیزی کا عنصر شامل ہے تو اس سے بدگمان ہونے کا انہیں اس لئے اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس سے مراد سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ واقعات کی ظاہری سطح اور فنی رکھ رکھاؤ کے اندر تحت البیان اور زیریں لہر کے طور پر مصنف مادی حقائق کے بجائے نفسیاتی، اقداری اور

ذہنی کیفیات کو جس طرح نمایاں کرنا چاہتا ہے وہ بہر حال قابل داد ہے۔ مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا بنیادی موضوع قدروں کا زوال ہے۔ وہ نت نئے انداز اور نت نئے واقعات اور صورت حال کی مدد سے اس مسئلے کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو اگر ہم سہل پسندانہ انداز میں کوئی نام دینے کی کوشش کریں تو آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ افسانے کے اسلوب اور ہیئت میں زیادہ تجربہ کرنے کے قائل نہیں۔ مگر فکشن کی روایت پر ان کی گرفت مضبوط ہے اس لئے بیانیہ پر بھی ان کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔

فکشن کی شعریات میں اس کے فنی لوازم، زبان وبیان، تکنیک اور اوّلیں مباحث کو نئے سیاق وسباق میں استعمال کی طرف جو توجہ ادھر مرکوز کی جانے لگی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ان مسائل سے بخوبی واقف ہیں مگر اس ضمن میں مسائل ومباحث سے واقفیت سے زیادہ ان کے لئے فکشن میں کارآمد طریقے پر استعمال کرنے کی اہمیت زیادہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر وانی بیانیہ کی نئی روایت کو بھی فنی سطح پر استعمال کرنے کی کوشش کریں اور رواداری کی نوعیت اور زمانی ساخت کو بھی مختلف انداز واسلوب سے بھی پیش کرنے کی طرف توجہ مبذول کریں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اگر اپنے افسانوں کی زبان کو نسبتاً زیادہ تہہ دار اور کرداروں کو ہمہ جہت بنانے پر توجہ دیں تو ان کے افسانوں میں مزید چار چاند لگ سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی کیا کم ہے کہ ان کو افسانے کے فنی تقاضوں کا بھرپور احساس ہے۔ وہ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے اپنے اسلوب کا انتخاب کرتے ہیں اور کرداروں کی نفسیات میں بھی گہرائی تک اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی تکنیک البتہ روایتی طرز سے مختلف نہیں ہوتی تاہم اس بات کے سبب ان کے فن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ وہ اگر اپنی افسانہ نگاری کے سفر میں اپنے تجربات اور مشاہدات کو زیادہ رہنما بنائیں تو یہی ان کی سب سے بڑی طاقت ثابت ہو سکتی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا افسانوی مجموعہ اشاعت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اردو کے افسانوی منظرنامے میں ان کا ورود ایک فال نیک قرار دیا جاسکتا ہے۔

■❖■

پروفیسر محمد زماں آزردہ
(سری نگر کشمیر)
09419007939

'اندر کی باتیں' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک زمانے سے کہانیاں لکھ رہے ہیں ان کے کئی مجموعے بھی شائع کر کے اہل نظر سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ہندوستان میں مہاراشٹر اور دوسری ریاستوں نے انعامات سے بھی نوازہ ہے۔ اردو کے ادبی حلقوں میں ان کی اور ان کی کہانیوں کی پذیرائی برابر ہوتی رہی ہے۔ ایک بات ان کی کہانیوں میں بطور خاص محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ ایک ایسی تلخی ہے جس کو الفاظ کے لباس میں مستور رکھنے کے باوجود کوئی بھی محسوس کر سکتا ہے البتہ جو لوگ ان کو قریب سے جانتے ہیں ان سے یہ پوشیدہ نہیں ہے کہ مشتاق احمد وانی شہر سے بہت دور ایک دیہات میں رہتے ہیں پیشے سے یہ استاد ضرور ہیں مگر لکھنا پڑھنا انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ غالباً اسی لئے ان کے کارناموں پر جموں یونیورسٹی سے ایم فل ڈگری کے لئے ایک تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے۔ ان کا دائرہ کار یونیورسٹی اور کالجوں کے غیر علمی مباحث سے کافی الگ تھلگ رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی ادبی کاوشیں جو سامنے آئی ہیں۔ ان کی تخلیق، ترتیب اور تالیف میں ان کو کتنی مشکلیں پیش آئی ہوں گی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کتنے مآخذ ان کی کوششوں کے باوجود ان سے بہت دور رہے ہوں گے مگر یہ کیا کم ہے کہ دور دیہات میں بیٹھ کر اسکول کے ماحول میں کام کر کے اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگوں کے رابطے میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنی

ایک شناخت بنائی ہے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی کہانیوں کو فن اور اسلوب کے لحاظ سے نہیں دیکھنا چاہیئے جس نظر سے ہم آج ہیمنگ وے کی کہانیوں کو یا اردو میں منٹو اور کرشن چندر وغیرہ کی کہانیوں کو دیکھتے ہیں کہ کیونکہ جس ماحول کو مشتاق احمد وانی نے دیکھا، برتا اور سہا ہے ان لوگوں نے ایسے ماحول کو صرف سوچا ہے۔ مشتاق احمد وانی کے ماحول کے تناظر میں دیکھیں تو ان کے افسانے اردو ادب میں اہم ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کا تازہ مجموعہ 'اندر کی باتیں' مقبول ہوگا اور اس کی پذیرائی ہوگی۔ میں دعا گو ہوں کہ مشتاق احمد وانی صاحب کی کوششیں ایسا رنگ لائیں کہ خود مشتاق احمد وانی کی زندگی میں نئے رنگ بھر جائیں۔

■❖■

پروفیسر شریف احمد قریشی (رام پور)
09027257007

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

کامیاب اور منفرد افسانہ نگار

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا نام ادبی حلقوں میں غیر معروف نہیں ہے۔ وہ بیک وقت محقق بھی ہیں اور نقاد بھی، مبصّر بھی ہیں اور مفکر بھی اور ایک کامیاب منفرد و معتبر افسانہ نگار بھی ہیں۔ وہ سابقہ کئی دہائیوں سے اُردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ اُن کے بے شمار تحقیقی، تنقیدی و تجزیاتی مقالات و مضامین اور افسانے موقر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کی متعدد گراں مایہ نگارشات زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر قبولِ خاص و عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری کے لئے قلم بند کیا گیا اُن کا تحقیقی مقالہ ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' اور ڈی۔لِٹ۔ ڈگری کے لئے سپردِ قلم کیا گیا اُن کا تحقیقی مقالہ ''اُردو ادب میں تانیثیت'' کی حیثیت نہ صرف دستاویزی ہے بلکہ تاریخ ساز بھی ہے۔ اُن کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے مجموعوں آئینہ در آئینہ، اعتبار و معیار اور شعورِ بصیرت کی بھی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے۔ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ہزاروں غم'' 2001ء میں منظرِ عام پر آیا اور دوسرا مجموعہ ''میٹھا زہر'' 2008ء میں طبع ہوا۔ اُن کے تیسرے افسانوی مجموعہ کا نام ''اندر کی باتیں'' ہے جو اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

''میٹھا زہر'' کی اہمیت وافادیت کے اعتراف میں شعبۂ اُردو، جموں یونی ورسٹی نے ''مشتاق احمد وانی: بحیثیت افسانہ نگار'' کے موضوع پر شکتی دیوی کو 2011ء میں ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا قلم بہت تیز اور رواں ہے۔ وہ تھک کر بیٹھنے والے قلم کار نہیں ہیں۔ وہ ایک ایسے دیدہ ور فنکار ہیں جو اپنے اطراف کا نہایت گہرائی اور گیرائی سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف سوچنے اور سمجھنے والا ذہن رکھتے ہیں بلکہ کچھ کر گزرنے کی تگ ودَو میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کئی کتابیں زیرِ اشاعت اور زیرِ ترتیب ہیں جن میں سے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ''افہام وتفہیمِ زبان وادب'' اور خودنوشت سوانح ''خارستان کا مسافر'' نہایت اہم ہیں۔

زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''اندر کی باتیں'' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو اُن کے بارہ منتخب افسانوں ''اندر کی باتیں، بابا کو کچھ ہوگیا ہے، جسم خور کیڑا، آنکھوں کی عصمت دری، سرگوشی، چھپا سانپ، ایک اہم سوال، باغی، فتنہ، چہرہ چھپائے لوگ، باہر اور اندر کا منظر اور پانچ سال کا بن باس'' پر مشتمل ہے۔ شاملِ مجموعہ افسانوں کے مطالعہ کے بعد مَیں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک کامیاب، منفرد اور معتبر افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے تمام افسانے محض افسانے یا فکشن نہیں ہیں بلکہ حقیقی فکشن (Factual Fiction) ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے لئے مواد وموضوعات کا انتخاب اسی معاشرے اور اپنے اردگرد کے ماحول سے اخذ کرتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے تمام افسانے زندگی، معاشرے اور حالات ومسائل سے پوری طرح مربوط ہونے کے ساتھ عصری منظر نامہ بھی ہیں اور عہد حاضر کی تاریخ وتنقید بھی ہیں۔ اُن کے افسانے مفروضی نہیں بلکہ مقصدی ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے تمام افسانے اپنے اردگرد کے حالات، انسانی نفسیات، زمانہ کی کجروی، ناآسودگی، اعلیٰ اقدار کی زبوں حالی، سماجی مسائل، بدعنوانی، جنسی بے راہ روی، سیاسی چال بازیوں، ادھورے سپنوں، ازدواجی زندگی کی تلخیوں، ذہنی کشمکش اور متعدد تلخ حقائق کے آئینہ دار ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ عہدِ حاضر کے مسائل و حالات اور تقاضوں کا تجزیہ بھی کرتے ہیں اور کہانی کو بلند جذباتی ونفسیاتی پہلو سے ہم آہنگ

کرتے ہوئے مسحّر آفریں اسلوب سے قارئین کے دلوں کو گرماتے بھی ہیں اور اُنہیں متاثر کر کے غور و فکر کے لئے مجبور بھی کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ساحل ہی سے موجوں کی اٹھکھیلیوں کا نظارہ کرنے والے فنکار نہیں ہیں۔ اُنہوں نے نہ صرف سمندروں کے دھاروں کو چیرا ہے بلکہ تھپیڑے بھی کھائے ہیں۔ اُنہوں نے صرف ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہی کہانیوں کی تخلیق نہیں کی ہے بلکہ حالات و زندگی کی ٹھوکریں کھا کر مشاہدات اور تجربات کی مدد سے کہانیوں میں کمالِ فن سے رنگ بھی بھرا ہے یعنی جگر کو خون کر کے کہانیاں لکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے تجربات، احساسات اور مشاہدات اُن کی کہانیوں میں ذہنی، اخلاقی اور جذباتی زندگی کا جزو بن کر اُبھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ دراصل اُنہوں نے اپنے ذاتی مطالعہ، مشاہدہ، محاسبہ، معلومات اور تجربات سے جو کچھ حاصل کیا ہے اُسے تر و تازہ رکھ کر افسانوی پیکر میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

افسانہ ''اندر کی باتیں'' محض افسانہ نہیں بلکہ اصل واقعہ پر مبنی کہانی ہے۔ یہ کہانی کسی اور کی نہیں خود تخلیق کار مشتاق احمد وانی کی آپ بیتی ہے۔ کہانی کا کردار کمل کانت خود مشتاق احمد وانی ہے جسے ذہانت، قابلیت اور اہلیت کے باوجود ایک یونی ورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی اسامی کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔ چترنجن باسو جیسے رشوت خور، بدکار، بے ایمان اور بدمعاش شخص کی سفارش اور کوشش سے خیالو رام جیسے نااہل کی تقرری کر دی گئی تھی۔ اس کہانی کے کردار کمل کانت اور افسانہ نگار مشتاق احمد وانی جیسے بے شمار مستحق اُمیدوار جن کی آنکھوں کی بینائی لکھتے پڑھتے اور تیاری کرتے کرتے کمزور ہو جاتی ہے، در در کی ٹھوکریں کھاتے، بھٹکتے اور کرب میں مبتلا رہتے ہیں اور چترنجن باسو جیسے بدکار اور رشوت خور خیالو رام جیسے نااہل کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ موضوع اور فن پر پوری طرح گرفت رکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں موضوع کا تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ جنس پرستوں، واسنا میں ڈوبے ہوئے بھوکے بھیڑیوں، نام نہاد سادھوؤں، سنتوں، مذہبی رہنماؤں، جعل سازوں، مفاد پرستوں، سفید پوش سیاہ کاروں کی سیاہ کرتوتوں کو اپنی

کہانیوں کے ذریعہ نہایت فنی چابک دستی سے بے نقاب کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ "بابا کو کچھ ہو گیا ہے"، "چھپا سانپ" اور "آنکھوں کی عصمت دری" جیسے افسانے اُن سادھوؤں، سنتوں کے دوہرے کردار کو اُجاگر کرتے ہیں جو بظاہر تو بھگوان کے پجاری معلوم ہوتے ہیں مگر بہ باطن جنس زدہ، واسنا پرست، ہَوا و ہَوس میں مبتلا اور پاک رشتوں کو ناپاک کرنے والے ہیں۔ سماج میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے، ایسے لوگ معصوم اور بھولے بھالے عوام و سادہ لوح خواتین کو گمراہ کر کے اپنے دامِ فریب میں پھنسا کر اُن کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ "بابا کو کچھ ہو گیا ہے" کے جیسے اب نہ جانے کتنے بابا، سادھو، سنت، رام کتھا، وعظ، تقاریر اور اُپدیش کے ذریعہ دوسروں کو راہِ راست پر لانے کا ڈھونگ کرتے رہتے ہیں اور خود چانڈو، فرونی، افیون، چرس، گانجا، بھنگ اور شراب جیسی نشہ آور اشیاء کا بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔

"چھپا سانپ" کے کردار پنڈت رتن شاستری کی وضع قطع کے سبب لوگ اُنہیں بھگوان کا روپ سمجھتے تھے۔ اُنہیں صرف رامائن اور گیتا ہی کا گیان نہیں تھا بلکہ وہ چاروں ویدوں کے بھی عالم تھے۔ سر مُنڈا ہوا، جسم پر سفید دھوتی کُرتہ، ماتھے پر چندن کا تلک، بغل میں پوتھی، ہاتھ میں کیسری رنگ کی مالا، پیروں میں کھڑاؤں، زبان پر منتر اور بھجن یہ ہے اُونچ کوٹی کے پنڈت رتن شاستری کا دل کش و دل فریب حلیہ۔ وہ پترا بھی بچارتے تھے اور جادو ٹونا بھی کرتے تھے۔ ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھ کر لوگوں کو خوف زدہ بھی کرتے تھے اور جھوٹی تسلّیاں دے کر اُنہیں بے وقوف بھی بناتے رہتے تھے۔ جنم مرن اور دیگر تقریبات کے موقع پر لوگ اُنہیں ریت رسم اور سنسکار کے لئے نہایت ادب و احترام سے مدعو کرتے تھے۔ نذرانے اور تحائف کے علاوہ اُن کی خاطر و تواضع مقوّی غذاؤں سے کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جوان ناری پر نظر پڑتے ہی اُن کے شریر کی پانچوں اِندریوں میں کلبلاہٹ ہونے لگتی تھی۔ اُن کی پتنی کملیش کماری بیماری کے سبب سرد سی ہو گئی تھی اس لئے وہ کہیں اور منہ مارنے کے فراق میں بے چین رہتے تھے۔ ایک روز اُنہوں نے بالجبر اپنی جنسی ہَوس کا شکار اپنی بہو مینا کشی کو بنا ڈالا۔ وہ بے چاری پر کٹے پرندہ کی طرح پھڑ پھڑاتی رہ گئی اور جب کچھ دنوں کے بعد اُنہوں نے پھر اُس کے ساتھ زبردستی کی تو اُس نے پھانسی لگا کر اپنی جان

کرتے ہوئے سحر آفریں اسلوب سے قارئین کے دلوں کو گرماتے بھی ہیں اور اُنہیں متاثر کر کے غور وفکر کے لئے مجبور بھی کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ساحل ہی سے موجوں کی اٹھکھیلیوں کا نظارہ کرنے والے فنکار نہیں ہیں۔ اُنہوں نے نہ صرف سمندروں کے دھاروں کو چیرا ہے بلکہ تھپیڑے بھی کھائے ہیں۔ اُنہوں نے صرف ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہی کہانیوں کی تخلیق نہیں کی ہے بلکہ حالات وزندگی کی ٹھوکریں کھا کر مشاہدات اور تجربات کی مدد سے کہانیوں میں کمالِ فن سے رنگ بھی بھرا ہے یعنی جگر کو خون کر کے کہانیاں لکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے تجربات، احساسات اور مشاہدات اُن کی کہانیوں میں ذہنی، اخلاقی اور جذباتی زندگی کا جزو بن کر اُبھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ دراصل اُنہوں نے اپنے ذاتی مطالعہ، مشاہدہ، محاسبہ، معلومات اور تجربات سے جو کچھ حاصل کیا ہے اُسے تروتازہ رکھ کر افسانوی پیکر میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

افسانہ ''اندر کی باتیں'' محض افسانہ نہیں بلکہ اصل واقعہ پر مبنی کہانی ہے۔ یہ کہانی کسی اور کی نہیں خود تخلیق کار مشتاق احمد وانی کی آپ بیتی ہے۔ کہانی کا کردار کمل کانت خود مشتاق احمد وانی ہے جسے ذہانت، قابلیت اور اہلیت کے باوجود ایک یونی ورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی اسامی کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔ چترنجن باسو جیسے رشوت خور، بدکار، بے ایمان اور بدمعاش شخص کی سفارش اور کوشش سے خیالو رام جیسے نااہل کی تقرری کر دی گئی تھی۔ اس کہانی کے کردار کمل کانت اور افسانہ نگار مشتاق احمد وانی جیسے بے شمار مستحق اُمیدوار جن کی آنکھوں کی بینائی لکھتے پڑھتے اور تیاری کرتے کرتے کمزور ہو جاتی ہے، دردر کی ٹھوکریں کھاتے، بھٹکتے اور کرب میں مبتلا رہتے ہیں اور چترنجن باسو جیسے بدکار اور رشوت خور خیالو رام جیسے نااہل کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ موضوع اور فن پر پوری طرح گرفت رکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں موضوع کا تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ جنس پرستوں، واسنا میں ڈوبے ہوئے بھوکے بھیڑیوں، نام نہاد سادھوؤں، سنتوں، مذہبی رہنماؤں، جعل سازوں، مفاد پرستوں، سفید پوش سیاہ کاروں کی سیاہ کرتوتوں کو اپنی

کہانیوں کے ذریعہ نہایت فنی چابک دستی سے بے نقاب کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ بابا کو کچھ ہو گیا ہے، چھپا سانپ اور ''آنکھوں کی عصمت دری'' جیسے افسانے اُن سادھوؤں، سنتوں کے دوہرے کردار کو اُجاگر کرتے ہیں جو بظاہر تو بھگوان کے پجاری معلوم ہوتے ہیں مگر بہ باطن جنس زدہ، واسنا پرست، ہَوا و ہوس میں مبتلا اور پاک رشتوں کو ناپاک کرنے والے ہیں۔ سماج میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے، ایسے لوگ معصوم اور بھولے بھالے عوام و سادہ لوح خواتین کو گمراہ کر کے اپنے دامِ فریب میں پھنسا کر اُن کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ ''بابا کو کچھ ہو گیا ہے'' کے جیسے اب نہ جانے کتنے بابا، سادھو، سنت، رام کتھا، وعظ، تقاریر اور اُپدیش کے ذریعہ دوسروں کو راہِ راست پر لانے کا ڈھونگ کرتے رہتے ہیں اور خود چانڈو، فرونی، افیون، چرس، گانجا، بھنگ اور شراب جیسی نشہ آور اشیاء کا بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔

''چھپا سانپ'' کے کردار پنڈت رتن شاستری کی وضع قطع کے سبب لوگ اُنہیں بھگوان کا روپ سمجھتے تھے۔ اُنہیں صرف رامائن اور گیتا ہی کا گیان نہیں تھا بلکہ وہ چاروں ویدوں کے بھی عالم تھے۔ سر مُنڈا ہوا، جسم پر سفید دھوتی کُرتہ، ماتھے پر چندن کا تلک، بغل میں پوتھی، ہاتھ میں کیسری رنگ کی مالا، پیروں میں کھڑاؤں، زبان پر منتر اور بھجن یہ ہے اُونچ کوٹی کے پنڈت رتن شاستری کا دل کش و دل فریب حلیہ۔ وہ پترا بھی بچارتے تھے اور جادو ٹونا بھی کرتے تھے۔ ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھ کر لوگوں کو خوف زدہ بھی کرتے تھے اور جھوٹی تسلّیاں دے کر اُنہیں بے وقوف بھی بناتے رہتے تھے۔ جنم مرن اور دیگر تقریبات کے موقع پر لوگ اُنہیں ریت رسم اور سنسکار کے لئے نہایت ادب واحترام سے مدعو کرتے تھے۔ نذرانے اور تحائف کے علاوہ اُن کی خاطر و تواضع مقوّی غذاؤں سے کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جوان ناری پر نظر پڑتے ہی اُن کے شریر کی پانچوں اِندریوں میں کلبلاہٹ ہونے لگتی تھی۔ اُن کی پتنی کملیش کماری بیماری کے سبب سرد سی ہو گئی تھی اس لئے وہ کہیں اور منہ مارنے کے فراق میں بے چین رہتے تھے۔ ایک روز اُنہوں نے بالجبر اپنی جنسی ہوس کا شکار اپنی بہو مینا کشی کو بنا ڈالا۔ وہ بے چاری پر کٹے پرندہ کی طرح پھڑ پھڑاتی رہ گئی اور جب کچھ دنوں کے بعد اُنہوں نے پھر اُس کے ساتھ زبردستی کی تو اُس نے پھانسی لگا کر اپنی جان

مالکِ حقیقی کے سپرد کر دی۔ پنڈت رتن شاستری جیسے نہ جانے کتنے رنگے سیار آئے دن بہنوں، بیٹیوں اور بہوؤں کی بالجبر عصمت دری کرتے رہتے ہیں۔ کچھ درندوں کی کالی کرتوتیں تو میڈیا وغیرہ کے ذریعہ بے نقاب ہو جاتی ہیں مگر بیشتر حوّا کی دُکھیاری بیٹیاں شرم و حیا اور لوک لاج کے سبب سفید پوشوں کی سیاہ کاریوں کو اپنے سینے میں دفن کر کے زندگی بھر اندر ہی اندر گھُٹتی رہتی ہیں یا ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' کہتے ہوئے اپنی جان دے کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی ہیں۔ دراصل تخلیق کار نے اپنے اس افسانہ کے ذریعہ اندھی تقلید نہ کرنے، رنگے سیاروں کے دامِ فریب میں نہ پھنسنے اور بھو کے بھیڑیوں سے ہوشیار رہنے کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔

چھپا سانپ، آنکھوں کی عصمت دری، سرگوشی، چہرہ چھپائے لوگ اور اُن کے دیگر افسانے جنسی تقاضے، جنسی جذبات، جنسی بے راہ روی، جنسی شدّت، جنسی کشمکش، جنسی مسائل، جنسی حقائق، ناشایستہ رویّوں اور نفسیاتی تغیرات کے بہترین ترجمان ہیں۔ ''چہرہ چھپائے لوگ'' کالج کی تین لڑکیوں پونم، ہرپریت کور اور فوزیہ بانو کی ایسی کہانی ہے جو آئے دن رونما ہوتی رہتی ہے۔ یہ تینوں لڑکیاں اپنے چہروں کو چھپا کر اپنے عاشقوں بلکہ اوباش لڑکوں کے ساتھ موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر کالج سے بہت دور جا کر اپنے جسم کی آگ بجھانے کے لئے گھنے جنگل میں روپوش ہو جاتی ہیں۔ ''آنکھوں کی عصمت دری'' کے پنڈت میگھ ناتھ عہد حاضر کے جنسی شدّت پسند ماحول سے نہ صرف بیزار نظر آتے ہیں بلکہ خود کو ایک عرصہ تک سنبھالے بھی رہتے ہیں مگر اکیاون سال کی عمر میں ایک بلو فلم دیکھ کر اُن کے جسم کی اُتھل پتھل سے اُنہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ اُن کی آنکھوں نے زنا بھی کیا ہے اور وہ اپنی سب سے قیمتی چیز بھی لُٹا چکے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے جس فنکارانہ چابک دستی سے خارجی دنیا کے حادثات و واقعات کو اپنی کہانی میں پیش کیا ہے اُتنی ہی فنّی مہارت سے داخلی زندگی کی حسرتوں، خواہشوں اور نفسیاتی مسائل کو بھی اپنی کہانیوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے افسانوں میں کرداروں کے مزاج و اطوار، نفسیاتی پیچیدگیوں، طبقاتی جبلتوں اور حقیقی خدوخال کو نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا افسانہ ''جسم خور کیڑا'' پڑھ کر گوتم بُدھ کی اس فکرو تجسس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کہ انسان کیوں بوڑھا ہو جاتا ہے اور انسان کیوں مر جاتا ہے؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس افسانے کی حسین نوری اور خوب رو غلام عبّاس کے جسم نہ تو پہلے جیسے گداز اور سڈول ہیں اور نہ اُن کے خدوخال میں پہلی جیسی کشش باقی ہے۔ وہ اپنی شادی کے البم کی تصویریں دیکھ کر عمر رفتہ کو آواز تو دیتے ہیں مگر حُسن، خوبصورتی اور توانائی سے بتدریج محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اپنے اس افسانے اور اپنے منفرد اندازِ بیان کے ذریعہ قاری کو ایک ایسی سچّائی سے آشنا کرانے کی کوشش کی ہے جسے کبھی جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

''پانچ سال کا بن باس'' اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد کہانی ہے۔ یہ اُن باصلاحیت نوجوانوں کو ہمّت و حوصلہ عطا کرتی ہے جن کے دل میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ تو ہوتا ہے مگر ناساز گار حالات اور سہولت کے فقدان کے سبب دور دراز یا پس ماندہ علاقوں میں جانا پسند نہیں کرتے ہیں۔ اس افسانہ کی زلفاں بی بی امان اللہ کی سب سے بڑی بیٹی ہے جس نے باٹنی میں ایم۔ ایس۔ سی۔ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ ریسرچ کرنے کی تیاری کر رہی تھی کہ اُس کے آبائی گاؤں کے ایک پرائمری اسکول میں بہ حیثیت معلّمہ پانچ سال کی مدّت کے لئے اُس کی تقرری ہو جاتی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے والد کے کہنے پر اس سروس کو قبول کر لیتی ہے اور تمام پریشانیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انتھک محنت، لگن اور صلاحیت سے نہ صرف اس اسکول بلکہ اُس گاؤں کی بھی کایا پلٹ دیتی ہے۔

''اندر اور باہر کا منظر'' ایک ایسا افسانہ ہے جس کے ذریعہ ایسے مشہور دُکانداروں کی قلعی کھولی گئی ہے جن کی دُکان کی چیزیں بظاہر جتنی اصلی، عمدہ اور نفیس معلوم ہوتی ہیں یا مشہور کر دی جاتی ہیں۔ اُتنی ہی اُن میں ملاوٹ اور گندگی کے جراثیم بھی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی متوازن اور معتدل فکر اور سوچ کے مالک ہیں۔ وہ نہ تو جانب داری سے کام لیتے ہیں اور نہ حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں بلکہ تلخ حقائق سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اُن کا افسانہ ''باغی'' تعلیم یافتہ جیون داس برہمن کی کہانی ہے جو کومل نامی داسی سے کورٹ میرج کر کے دھرم، مذہب، ذات پات کے ٹھیکے داروں اور فرقہ

پرستوں پر کاری ضرب لگا کر ترقّی کے لئے ترقّی پسند خیالات کی اشاعت کرنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شہری اور قصباتی زندگی کی موثر اور ہو بہو تصویر کشی میں بھی بلا کی مہارت رکھتے ہیں۔ اُن کے بعض افسانے مختلف کرداروں کے مزاج واطوار، شہروں کی ہوش ربا زندگی، قصبوں اور دیہاتوں کی دل کشی اور کائنات کے خوش نما قدرتی مناظر کے بہترین عکّاس ہیں۔ بطورِ مثال پیش ہے ایسے ہی چند مناظر کی تصویر کشی:

''آج اتوار تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہنستے مسکراتے ایک وسیع وعریض اور دل کش پارک میں پہنچ چکے تھے۔ تقریباً ہر عمر کے مرد وعورتیں چنبیلی، نرگس، جنگلی موتیا، چھوئی موئی، گیندے، رات کی رانی اور سُرخ وسفید گلاب کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے اپنے دماغوں کو معطر کر رہے تھے۔ پورے پارک میں کُل آٹھ چنار کے پیڑ ترتیب وار نصب تھے جن کی گھنی چھاؤں میں ہر شخص تازگی اور راحت محسوس کرتا۔ ان کے علاوہ دیودار اور مور پنکھ کے چھوٹے چھوٹے پیڑ پارک کی خوب صورتی اور دل کشی کے ساتھ سیر وتفریح کرنے والوں کو اپنی طرف راغب کر رہے تھے۔ پورے پارک میں چاروں جانب پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ لوہے کے خوش نما بینچ لگے ہوئے تھے۔'' (افسانہ: سرگوشی)

''نریش رانا کا سات ستارہ ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ مہانگر کے بالکل وسط میں ہر خاص وعام کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ کھانے پینے اور رہائش کی تمام سہولیات اس میں موجود ہیں۔ سرمایہ دار طبقے کے لوگ اس میں شوق سے ٹھہرتے ہیں۔ جب کہ مفلوک الحال طبقہ کے لوگ اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک دنیا اس میں آباد رہتی ہے۔ طرح طرح کے

ارمان بھرے دلوں کے لوگوں کا اس میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ دس منزلہ یہ عالی شان ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ ہر وقت نئ نویلی دلہن کی طرح سجا رہتا ہے۔ خاص کر رات کے وقت جب بجلی کے قمقموں کی دھنک رنگ روشنی سے پل پل میں پورے ہوٹل کے چاروں سمتوں پر مختلف طرح کے خوش نما ڈیزائن تیار ہوتے چلے جاتے ہیں تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اس ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ کی ہر چیز نہایت نفیس، دیدہ زیب، آرام دہ اور عمدہ ہے کہ جو اس میں ٹھہرنے والوں کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔ اس میں داخل ہونے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے اُس کے دل و دماغ سے دنیا کے غموں، اُلجھنوں اور مسائل کا غبار دھل گیا ہو اور جسمانی و روحانی سکون کے تمام دروازے اُس کے لئے کھل گئے ہوں۔" (افسانہ: اندر کی باتیں)

"کیسری رنگ کا کُرتہ، سفید دھوتی، ماتھے پہ چندن کا تلک، سر پہ بودی اور کندھے سے لٹکتا ہوا جھولا میگھ ناتھ کی ایک مخصوص شناخت تھی۔ سیدھے سادے، نرم مزاج، کام، کرودھ، موہ، لوبھ اور اہنکار سے کوسوں دور اپنی ڈیوٹی کے پابند، زبان پر ہر وقت اوم، ہری اوم کا ورد رہتا، پرائی عورت پر نظر ڈالنا مہاپاپ سمجھتے تھے۔ صبح جب وہ اپنے دفتر کی طرف نکلتے تو راستے میں ایک کمہارن اپنی دُکان پر سجی سنوری بیٹھی دکھائی دیتی جس کے بال بکھرے ہوئے، کندھوں تک موٹی ننگی باہیں اور قمیض کا گلا اتنا نشیبی کہ اُس کی معمولی جنبش سے قدرت کا انمول خزانہ ہمک ہمک کے باہر آنے کو ترستا۔ اُس کے سُرخ گالوں اور موٹی موٹی آنکھوں میں نشے کی سی کیفیت پر جوں ہی میگھ ناتھ کی اچانک نظر پڑتی تو وہ فوراً نظر پھیر لیتے اور گناہ کا احساس اُن کے رگ و ریشے میں دوڑ جاتا۔ (افسانہ: آنکھوں کی عصمت دری)

دراصل ڈاکٹر مشتاق احمد وانی معاشرتی، نفسیاتی اور اخلاقی مسائل اور عصری

حالات و واقعات کو پہلے مختلف زاویوں سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں پھر اُس کا پلاٹ تیار کر کے افسانے کے فارم میں ڈھال دیتے ہیں۔ اُن کی کہانیاں تہہ دار ہوتے ہوئے بھی پیچیدہ اور گنجلک نہیں ہیں۔ اُن کا لب ولہجہ سلیس اور شستہ ہے۔ طرزِ بیان میں ادبیت اور شگفتہ اسلوب کے سبب اُن کی باتیں نہ صرف دل و دماغ میں ثبت ہو جاتی ہیں بلکہ روح کی گہرائیوں میں بھی اُتر جاتی ہیں۔ کہانی، پلاٹ، کردار، منظر نگاری، مکالموں کی چستی و برجستگی اور واقعات کی ترتیب کے اعتبار سے اُن کی کہانیاں منفرد نظر آتی ہیں۔ اُنہیں اپنے کرداروں کی جذباتی، نفسیاتی اور مزاجی کیفیات کو تصادم، تکرار اور تضاد کے ذریعہ بامعنی اور بامقصد بنانے کے ساتھ افسانوں میں دل چسپ رنگ بھرنے میں بھی ملکہ حاصل ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے تمام افسانے لایعنی، بے ربط، منتشر اور مبہم خیالات، علامات و استعارات سے پاک وصاف ہیں۔ اُن کی کہانیاں جامع اور مکمّل ہونے کے ساتھ عہدِ حاضر کے حقائق و مسائل کی سچّی اور حقیقی تصاویر ہیں۔ کہانی، موضوع، تکنیک، اسلوب اور زبان و بیان کی انفرادیت اور دیگر فنّی خصوصیات کے سبب ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نہ صرف ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں بلکہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد بھی نظر آتے ہیں۔

■❖■

رفیق شاہین
(علی گڑھ، یوپی)
08979248741

مشتاق احمد وانی کا ایک شاہکار افسانہ 'اندر کی باتیں' تجزیہ

مجھے مشتاق احمد وانی کا افسانہ 'اندر کی باتیں' کے مطالعے نے افسردہ کردیا ہے۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ عصر حاضر کے پر آشوب اور دارو گیر معاشرے میں روحانی تہذیبی اور اخلاقی قدریں کماحقہ دم توڑ چکی ہیں۔ خود غرضی، مکاری وریا کاری، عیاری واداکاری، زر پرستی وزرگری، بے حسی و مردہ ضمیری، بدعنوانی و بدنظمی جیسی تمام بدعتوں اور برائیوں کا سماج میں ہر جگہ بول بالا ہے اور مظلوم انسانیت بڑی بے بسی سے بدی وبدکاری کے ہاتھوں نیکی وصداقت کی پسمائی اور ذلت وخواری کے المناک ودردناک منظر اپنی نمناک آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور ہے۔ آج سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی، مذہبی اور تعلیمی کوئی بھی شعبۂ حیات ایسا نہیں ہے جہاں Corruption نے اپنی جڑیں مستحکم نہ کرلی ہوں۔ صاحبان اقتدار حقدار کو اس کے حق سے محروم کرکے اور پرائے حق کو نااہلوں کے ہاتھ فروخت کرکے بے ایمانی سے کمائی لاکھوں کی دولت پر ذرا بھی شرمسار نہیں ہوتے بلکہ بددیانتی کو اپنی ذہانت وذکاوت پر محمول کرکے فخریہ انداز میں خود کو شاباشی دیتے ہیں۔ کہانی میں شعبۂ تاریخ کے سربراہ چترنجن باسو کا اسسٹنٹ پروفیسری کے امیدوار کمل کانت کو اپنی تگڑم بازی سے ناحق قرار دلوانا اور انتہائی نااہل خیالورام کو پانچ لاکھ بطور رشوت لے کر اپنے شعبے کا پروفیسر بنوادینا۔ بے حسی، مردہ ضمیری، بددیانتی اور بے غیرتی کی ایک ایسی ہی المناک

وشرمناک اور افسوسناک مثال ہے۔ ہمارے معاشرے میں چترنجن باسو، منوج اگروال، کلدیپ سنگھ اور اسی سالہ کندن لعل جیسے بے ایمان اور ضمیر فروشوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان بکاؤ لوگوں کے الگ الگ بھاؤ ہوتے ہیں۔ چترنجن باسو نے تو ایک انسان کے مستقبل کا قتل اس لئے کیا کہ اس فعل بد سے اس نے پانچ لاکھ کی رقم اینٹھ لی اور ہاں وہ ۸۰ سالہ ضعیف وکثیف کندن لعل جس کے پاؤں قبر میں لٹکے ہوئے ہیں جب کمل کانت کو انٹرویو میں ناکام کرنے کے لئے وہ شاہجہاں اور ممتاز محل کی قبروں کا درمیانی فاصلہ معلوم کر رہا تھا۔ اس وقت اس بے ضمیر کو ذرا بھی خیال نہ آیا کہ کسی وقت بھی موت اس کی روح قبض کر سکتی ہے اور بھگوان کی عدالت میں وہ کیا جواب دے گا؟ انٹرویو کمیٹی میں دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ بھی موجود تھے۔ وہ چاہتے تو مداخلت کر کے ہر لحاظ سے مستحق امیدوار کو اس کا حق دلا سکتے تھے۔ اس سے دارالعلوم کا تعلیمی معیار بلند ہی ہوتا مگر وہ بھی اس بوڑھے عیار کے مضحکہ خیز سوالات پر تبسم ہی فرماتے رہے اور انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ خیالورام دارالعلوم کے نام پر سرتاسر دھبہ ہے کلنک ہے۔ اس کی وجہ بھی چترنجن باسو جیسے تیز طرار اور شاطر لوگ ہی ہوتے ہیں جو دوسروں کی نفسیاتی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر انہیں بہ آسانی اپنے شیشے میں اتار لیتے ہیں۔

بہرحال کہانی میں ہیرو کی پسپائی، مظلوم انسانیت کی پسپائی ہے۔ آج کے مادہ پرست زمانے اور صارفیت کے دور میں زرگری اور مادی لامحدود اشیاء کی ہوس وطلب نے انسان سے اس کی انسانیت چھین لی ہے۔ وہ جائز وناجائز کی تفریق سے ناآشنا ہے اور اب وہ غرض وہوس کا پتلہ دوسروں کے دکھ درد کو بالائے طاق رکھ کر صرف اور صرف اپنے اور اپنے مفادات تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

کہانی کار کے اسلوب یا طرز نگارش میں زبان کی سادگی، صفائی، شگفتگی، بے ساختگی، شستگی، شائستگی، تازگی، شیفتگی اور سیل بلا کی سی روانی بڑی لطیف اور فرحت بخش محسوس ہوتی ہے۔ کردار حقیقی ہیں جو زندگی سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کہانی کا متوقع مگر حقیقی انجام دیرپا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔

حقائق کی اساس پر استوار کامیاب اور موثر کہانی ترقیم کرنے پر میں اس کے خالق جناب ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو صمیم قلب سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر خالد اشرف
ایسوسی ایٹ پروفیسر کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی
0996828472

افسانے میں ایک نیا امکان

آج اردو افسانے کی عمر ایک صدی سے کافی زائد کا سفر طے کر کے نہایت مستحکم اور بسیط ہو چکی ہے۔ اگر غزل ہماری شاعری کی آبرو قرار دی جاتی ہے تو بلا شبہ نثری اصناف کی سرکردگی کا مقام کہانی یا افسانے کو حاصل ہو چکا ہے اور جب کوئی بھی صنف ادب وسعت اور بلوغت حاصل کرتی ہے تو اس کا ایک پہلو زمان و مکان سے آزادی کا ہوتا ہے اور دوسرا پہلو علاقائی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کا بھی موجود ہوتا ہے۔

علاقہ جموں و کشمیر نہ صرف اردو شاعری، ناول اور افسانے کا مستقل موضوع رہا ہے بلکہ اس خطے سے اردو کے کئی سرکردہ فکشن نگار سامنے آئے جنہوں نے کہانی کو ایک نیا محاورہ اور نیا مقامیہ (Locale) فراہم کیا۔ ان ہی فکشن نگاروں کے سلسلے میں ایک نام مشتاق احمد وانی کا بھی اضافہ ہوا ہے جو بنیادی طور پر افسانہ نگار محقق اور نقاد ہیں۔ زیر نظر افسانوی مجموعہ "اندر کی باتیں" وانی صاحب کا تیسرا مجموعہ ہے جس کی زیادہ تر کہانیاں ملک کے اہم رسائل میں طبع ہو چکی ہیں۔

جہاں تک ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا مجموعی تاثر ہے وہ یہ ہے کہ یہ کہانیاں دہلی اور ممبئی جیسے بڑے تجارتی و سیاسی مراکز سے دور بیٹھ کر لکھی گئی ہیں اور اسی لئے ان کے کرداروں کے آپسی رشتے زیادہ تیز رفتار اور زیادہ مغرب زدہ نہیں ہیں۔ یہاں پر یہ

سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک کی تہذیب وثقافت کو ایک اکائی کی شکل میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے یا اسے مختلف النوع ثقافتوں Cultures کا گلدستہ Collective قرار دیا جاسکتا ہے؟

میرے خیال میں کسی ملک یا علاقے کی ثقافت میں مذہب، زبان، رسوم، لباس، غذا اور لوک روایات کے علاوہ موسموں اور تیوہاروں کا بھی بنیادی رول ہوتا ہے۔ اسی لئے کسی ایک کلچر یا طرز فکر پر اصرار کرنا غیر جمہوری رویہ ہوتا ہے جو باہمی چپقلش اور تشدد کی طرف لے جاتا ہے۔ چونکہ ہندوستان دنیا کے چند بڑے ملکوں میں شمار ہوتا ہے اس لئے اس کو 'برصغیر' Sub Continent کہا جاتا تھا۔ چنانچہ آج بھی شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کے ہندوستانی صوبوں اور خطوں میں ثقافتی اشتراک کم اور اختلاف زیادہ پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف کوئی خطرناک یا پریشان کن عنصر نہیں ہے بلکہ ہماری رنگ برنگی تہذیب کی اساس ہے۔

اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ مشتاق احمد وانی کا افسانہ ان کے خطۂ مخصوص کا نہ صرف نمائندہ ہے بلکہ اس خطے کے تمام تر ثقافتی پہلو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے۔ ان کی کہانی کے بارے میں جو اولین تاثر ابھرتا ہے وہ اس کی قصباتی Town Based کلچر ہے جس کا بڑے شہروں کی چکا چوندھ، دولت کی فراوانی اور بے لگام آزادی کی پیدا کردہ عریانی وآوارگی سے کوئی رشتہ یا علاقہ نہیں ہے۔ یہ کلچر گاؤں اور قصبے کے نیم زراعتی اور نیم تعلیم یافتہ نظام اقدار کے تابع ہے جس میں ابھی رشتوں کی پائیداری بھی باقی ہے اور محلے پڑوس کا لحاظ پاس بھی لیکن ایسا نہیں ہے کہ مشتاق احمد وانی کی کہانیوں کا سماج جامد وساکن ہے اور یہ ہو بھی نہیں سکتا ہے۔ ایک طرف یہاں باہری آبادکاروں کا گزر کم ہے لیکن دوسری طرف ٹیلی ویژن، سنیما اور انٹرنیٹ کی پیدا کردہ حشر سامانیاں آہستہ آہستہ اس معاشرہ کو بھی مغربیت اور فرد پرستی Individualism کی طرف لے جارہی ہیں۔ اور اسی تبدیلی کی ناپسندیدگی کے پیدا کردہ تناؤ (Tension) کا اظہار افسانوں کے اس مجموعے میں ہورہا ہے جن کو آپ پسند یا ناپسند تو کرسکتے ہیں، نظر انداز نہیں کرسکتے۔

آیئے مشتاق احمد وانی کے افسانوں کو ذرا بالتفصیل ملاحظہ کریں۔ مثلاً ان کے

افسانے 'سرگوشی' کو لیں۔ یہ ایک ایسے نوجوان جوڑے کی کہانی ہے جو اپنے پابند معاشرے سے دور چھپ کر محبت اور قرب کے مواقع تلاش کرتا ہے لیکن یہاں دو کردار ایسے بھی ہیں جن کی فکر اور اعمال پر دقیانوسیت کی مہر لگی ہوئی ہے اور یہ ان دونوجوان دلوں کی ہم آہنگی کو برداشت نہیں کر پاتے ہیں۔ اسی طرح 'آنکھوں کی عصمت دری' کا میگھ ناتھ اپنے والدین کی دقیانوسیت کے آہنی شکنجے میں اس طرح فکری حسن سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی جدید ترقیات سے بے بہرہ ہونے کا خواہشمند ہے۔ وہ قدامت پرستانہ اقدار کے تحت زندگی بسر کرتا ہے اور کسی خوبصورت وجود کو نظر بھر دیکھنا بھی گناہ تصور کرتا ہے۔ اب نہ وہ سنیما دیکھنے کا اہل رہا ہے اور نہ ہی فن مصوری کے شاہکار۔ دراصل بے جا پابندیوں نے اس کی شخصیت کو مسخ کر دیا ہے۔ 'چہرہ چھپائے لوگ' بھی اسی نوعیت کا افسانہ ہے جس میں نوجوانوں کو آزادانہ جنس مخالف سے مراسم قائم کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ اسی لئے وہ والدین کی نگرانی سے بچ کر، آبادیوں سے دور، جنگلوں اور ویرانوں میں گناہ اور شرمندگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

'اندر کی باتیں' میں مصنف نے اس تعلیمی مافیا کے گھناؤنے کردار پر روشنی ڈالی ہے جس نے اس مقدس شعبے کو بے ایمانی، رشوت خوری اور اقربا پروری کے اڈے بنا دیا ہے۔ یہاں رشوتیں دے کر تقرر کیے جاتے ہیں، جعلی مقالے ڈگری کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ پروفیسروں اور پرنسپلوں کے گھروں پر خدمت کر کے لیکچرر کے عہدے حاصل کئے جاتے ہیں اور شراب پلا کر امتحانات کے رزلٹ تبدیل کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی چونکہ خود درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اس لئے وہ اس شعبے کی غلاظت کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

'چھپا سانپ' ایک جنسی مسئلے پر مبنی ہے جس میں ایک بوڑھا اپنی جنسی ہوس (یا ضرورت) کی تکمیل کے لئے اپنی بہو کو نشانہ بناتا ہے کیوں کہ خود اُس کی بیوی جسمانی طور پر تقریباً ناکارہ ہو چکی ہے۔ بہو ذلت وندامت کے ہاتھوں مجبور ہو کر خودکشی کر لیتی ہے اور بوڑھا رتن ناتھ شاستری قانون کی گرفت میں آجاتا ہے۔ 'جسم خور کیڑا' بھی بڑھاپے کے مسئلے کا احاطہ کرتا ہے لیکن جسمانی نہیں فلسفیانہ سطح پر یہاں بوڑھوں کی تنہائی اور ترقی یافتہ

سماج میں اولادوں کے ساتھ چھوڑ جانے کے مسئلے کو انسانی نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے کہ عمر کے آخری حصے میں انسان کو آخری منزل کا سفر یکہ وتنہا طے کرنا ہوتا ہے اور یہی جدید ترقیات کی شناخت بن گئی ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے عام مذہبی مفروضات کو موضوع بنا کر کچھ دلچسپ افسانے بھی 'قلمبند' کئے ہیں۔ مثال کے طور پر 'ایک اہم سوال' میں اس مفروضے پر سوال قائم کیا گیا ہے کہ دنیا میں ہر اچھا برا کام خدا کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا ہے۔ یہ دراصل ایک بہانہ ہے جو سماج کو غیر ذمہ داری اور تن آسانی کی طرف لے جاتا ہے۔ دراصل انسان صاحب عقل اور اشرف المخلوقات ہونے کی بنا پر اپنے ہر فعل کا ذمہ دار ہے اور خدا کو درمیان میں لانا مناسب رویہ نہیں ہے۔ افسانہ 'بابا کو کچھ ہو گیا ہے' میں ان نام نہاد سادھوؤں کی قلعی کھولی گئی ہے جو مذہب کی آڑ میں بہت سے جائز و ناجائز دھندے کرتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندوستان جنت نشان میں ان ڈھونگی باباؤں اور سادھوؤں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ کہانی 'فتنہ' میں ایک مسجد کے نوجوان امام کی ذرا سی غلطی کو مزاحیہ انداز میں موضوع بنایا گیا ہے کہ موبائل فون کی لعنت آج کل کیا کیا گل کھلا رہی ہے۔

'باہر اور اندر کا منظر' بھی ایک مزاحیہ نوعیت کا افسانہ ہے کہ تجارت پیشہ لوگ منافع کی ہوس کی تکمیل کے لئے کیا کیا پست طریقے استعمال کرتے ہیں۔

افسانہ 'باغی' ایک اہم سماجی مسئلے کو زیر بحث لاتا ہے۔ ذات پات میں تقسیم سماج میں جب ایک نوجوان ایک دلت دوشیزہ سے شادی کر لیتا ہے تو اس کو گھر میں اور گھر سے باہر کے پسماندہ معاشرے میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مشتاق احمد وانی کے افسانے اپنے اطراف کے روزمرہ کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں اور تیسری ادبی کاوش ہونے کی بنا پر ان کا یہ مجموعہ یقیناً توجہ دیے جانے کے لائق ہے۔

مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی مزید پختہ اور متنوع نوعیت کی کہانیاں لکھیں گے۔ افسانہ نگاری کا یہ سفر جاری رہنا چاہئے۔

■❖■

نورالحسنین
اورنگ آباد (مہاراشٹر)

دو باتیں ان افسانوں سے متعلق

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی سے میری پہلی ملاقات پنجاب کے ایک شہر مالیر کوٹلہ کے ایک سمینار میں ہوئی تھی، جسے اردو کے مشہور افسانہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے اپنے 'افسانہ کلب' کی جانب سے منعقد کیا تھا۔

مشتاق احمد وانی ایک عرصے سے افسانے لکھ رہے ہیں اور مختلف ادبی رسائل میں نظر آتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ضخیم مقالہ نسائی ادب کے موضوع پر کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ جسے ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا ہے۔ پچھلے دنوں انہوں نے مجھے اپنے افسانوں کا مسودہ بھیجا کہ میں اس پر کچھ لکھ دوں۔ وہ اپنا افسانوی مجموعہ شائع کرنا چاہتے ہیں۔

میرا وطیرہ ہے کہ میں اپنے بعد آنے والی ادبی نسل کی جہاں تک ہو سکے ہمت افزائی کرتا ہوں تاکہ وہ ادب سے پورے جوش کے ساتھ جڑی رہے۔ اسی نیت سے میں نے پورے خلوص کے ساتھ وانی کے افسانوں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اپنے افسانوں کے لئے مواد اپنے آس پاس ہی سے حاصل کرتے ہیں اور ان کے افسانوں کے کرداروں سے ہماری ملاقات ہر خطہ میں ہو جاتی ہے۔ انہیں افسانہ لکھنے کے لئے کبھی کسی بہت بڑے موضوع کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

افسانہ 'جسم خور کیڑا' ان ماں باپ کی کہانی ہے جو اپنے اطراف بے بس، مفلوک الحال اور اپنی اولادوں کے رویئوں سے پریشان والدین کو دیکھتے ہیں تو ان کے مستقبل کی

آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں۔ افسانہ 'ایک اہم سوال' انسان کی بداعمالیوں اور عہدے کے ناجائز استعمال سے کشید کی گئی دولت کا انجام سامنے لاتا ہے۔ یہیں پر جبر و اختیارات کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو افسانہ 'باغی' کے ذریعے قومی یکجہتی کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے، مذہبی چولا پہنے ہوئے سادھو سنتوں کی نشہ آور چیزوں کے استعمال پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔ افسانہ 'چھپا سانپ' اس جنس زدہ سسر کی بداعمالیوں کو بے نقاب کرتا ہے جو اپنی ہی بہو کے ساتھ اپنا منہ کالا کرتا ہے، افسانہ 'سرگوشی' ان دو دوستوں کی کہانی ہے جو اپنی شرارتوں سے دو محبت کرنے والوں کے درمیان نفاق پیدا کرتے ہیں۔ افسانہ 'آنکھوں کی عصمت دری' اس نوجوان کی کہانی ہے جو اپنی پہلی خطا کی ایسی سزا پاتا ہے کہ پھر جائز کام سے بھی احتیاط برتنے لگتا ہے۔ افسانہ 'فتنہ' باہر اور اندر کا منظر اور افسانہ 'چہرہ چھپائے لوگ' میں کہیں شخصیت پرستی، کہیں لڑکیوں اور لڑکوں کی بے راہ روی اور کہیں دھوکہ دہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں سب سے طویل افسانہ 'اندر کی باتیں' کالج اور یونیورسٹیوں میں ملازمت کے سلسلے میں ہونے والی دھاندلیوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

ان افسانوں کو ایک ابھرتے ہوئے قلم کار کی کاوشوں کے نظریے سے دیکھیں تو اس سے مستقبل کی اچھی امیدیں وابستہ ہو سکتی ہیں۔ اور یہ بھی احساس پیدا ہوتا ہے کہ انہیں کہانیاں سوجھتی ہیں اور وہ لکھنا چاہتے ہیں منظر کشی کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔

■❖■

رونق جمال
(ڈرگ چھتیس گڑھ)
09981072672

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی حق گو ادیب

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کی اردو بستیوں میں بھی ایک دیدہ ور نقاد، محقق، مفکر اور منفرد کہانی کار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے اب تک دو افسانوی مجموعے 'ہزاروں غم' اور 'میٹھا زہر' شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'اندر کی باتیں' شائع کروانے کی تیاری میں مشغول ہیں اسی سلسلے میں انہوں نے مسودے کی کاپی میرے پاس بھیج کر مجموعے میں شامل افسانوں پر میری رائے وخیالات کا اظہار اور تبصرے کی فرمائش کی ہے۔ فنی قلمکار کی تخلیق پر رائے دینا اپنے خیالات کا کھلے دل سے اظہار کرنا اور تبصرہ کرنا تینوں کام مشکل ہی نہیں نہایت مشکل ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی میرے عزیز ہیں۔ قابل ہیں، اچھے نثر نگار ہیں، حق کے پجاری ہیں، اور سچائی، حق گوئی، صاف گوئی کو ہضم کرنے کا مادہ رکھتے ہیں اس لئے میں نے جسارت کی ہے کہ 'اندر کی باتیں' میں شامل افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد چند سطریں لکھ کر دوستی کا فرض ادا کر دیا جائے۔

میری معلومات کے مطابق مشتاق احمد وانی نے اسکول کالج کے زمانے سے ہی قلم کو تھام لیا تھا اور نثر سے رشتہ جوڑ لیا تھا جبکہ اکثریت میں نوجوان شاعری کی پناہ میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن مشتاق نے نثر کا انتخاب کیا اور آج ان کے فیصلے نے انہیں بام عروج پر پہنچا

دیا۔ اکثر ان کی کہانیاں افسانے اور ملک کے مختلف رسائل میں میری نظروں سے گزرے ہیں۔ مشتاق کا اپنا انداز ہے ان کے لکھے پر کسی کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ مشتاق کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انہیں لکھنے کے لئے سوچنا نہیں پڑتا وہ حقیقتوں کو افسانے کا جامع پہنا کر نایاب تخلیق بنانے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ ان کا انداز بیان، قلم کی روانی، زبان پر گرفت ان کی تخلیقات میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں دلچسپی کی لے برقرار رکھتے ہوئے قلم کو چلانے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ مجموعے میں شامل افسانے ان کے مخصوص طرز اسلوب کے آئینہ دار ہیں جو قاری کے ذہن تک بہ آسانی رسائی پانے میں کامیاب رہیں گے۔ پیچیدگی اور ژولیدہ بیانی مجھے ان کے فن میں دور دور تک دکھائی نہیں دی یہ کمال ہی قلمکار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

مجموعے میں شامل پہلا افسانہ 'اندر کی باتیں' طویل افسانہ ہے۔ مشتاق نے ایک حقیقت کو افسانے کا رنگ دے کر قرطاس پر بکھیر کر قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ افسانے کے کے اختتام پر چترنجن باسو صاحب کا انجام پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ افسانے مطالعے سے سبق ملتا ہے کہ دوسروں کا برا چاہنے دوسروں کا برا کرنے اور حق تلفی کرنے کا خمیازہ چند لوگوں کو اس دنیا میں اور چند لوگوں کو آخرت میں ہر حال میں بھگتنا ہے۔ مشتاق اگر اس پلاٹ پر افسانے کی بجائے ناول لکھتے تو میرا ماننا ہے کہ یہ ان کا شاہکار ناول ہوتا۔ مجموعے کا دوسرا افسانہ ہے 'جسم خور کیڑا' جسم خور کیڑے میں مشتاق احمد نے آج کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ آج اولادیں، والدین کو ساتھ رکھنا نہیں چاہتی ہیں بلکہ زندگی کے آخری پڑاؤ پر انہیں اپنے سے دور کر دیتی ہیں یا ان پر احسان کرتے ہوئے اُنہیں اولڈ ایج ہوم بھیج دیتی ہیں۔ اس افسانے میں ایسے ہی والدین کا ذکر ہے۔ مجموعے کا تیسرا افسانہ 'فتنہ' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے ہر افسانے میں زمینی حقیقت سے جڑے دکھائی دیتے ہیں۔ فتنہ میں بھی مشتاق نے مسجد میں نماز کے دوران موبائل کی گھنٹی بج جانے کے عمل کو لے کر ایک اچھا افسانہ رقم کیا ہے۔ افسانہ پڑھ کر قاری اگر کچھ سیکھتا ہے تو یہ مشتاق کی استادی ہے۔ مجموعے کا چوتھا افسانہ 'ایک اہم سوال' ہے۔ ایک اہم سوال میں مشتاق نے نہایت اہم مسئلے پر افسانہ لکھا ہے۔ ہم بات بات میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی مرضی ہے، یہ بالکل غلط

ہے۔ اللہ کبھی برا نہیں کرتا ہے اور نہ وہ کسی کا برا چاہتا ہے۔ مشتاق نے نہایت خوبصورتی سے اس نازک مسئلے پر افسانہ لکھا ہے اور ایک عالم سے اس کے فرض کے دائرے میں پراثر مکالمے ادا کروا کر مشتاق نے اپنی دینی معلومات کے ساتھ ساتھ خدا پرستی کا ثبوت دیا ہے۔ مجموعے کا پانچواں افسانہ ہے 'بابا کو کچھ ہو گیا ہے'۔ بابا کو کچھ ہو گیا ہے طنزیہ افسانہ ہے۔ آج ہمارے ملک میں باباؤں کا جو حال ہے وہ آپ اور میں ٹی وی پر ہر روز دیکھ رہے ہیں۔ مشتاق نے بھی ایک ایسے ہی ڈھونگی بابا کو افسانے کا اہم کردار بنا کر باباؤں پر لفظوں کے تیر چلا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کا اچھا تجربہ کیا ہے۔ مشتاق افسانوں کے پلاٹوں کی طرح افسانوں کے عنوانات بھی چن چن کر لاتے ہیں۔ مجموعے کے اگلے افسانے کا عنوان ہے 'آنکھوں کی عصمت دری' آنکھوں کی عصمت دری میں مشتاق نے پرورش کو نشانہ بنایا ہے کہ بچوں کی جس طرح پرورش کی جاتی ہے وہ عملی زندگی میں اسی پرورش کو اپناتے ہیں۔ لیکن ہم ترقی کی دوڑ میں شامل ہو کر پرورش اور کردار کے معنی کھوتے جا رہے ہیں۔ اگلے افسانے کا عنوان ہے 'باغی' بغاوت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ لیکن جب بغاوت اولاد کرے وہ بھی ایک عورت کے لئے تو ماں باپ ٹوٹ جاتے ہیں اور ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ اس افسانے کا ہیرو بھی ایک لڑکی کے لئے ماں باپ سے سماج سے بغاوت کر دیتا ہے۔ وہ بھی ایک داسی لڑکی کے لئے۔ لڑکا برہمن ہے اور لڑکی کم ذات کی۔ لڑکا سماج کو اونچ نیچ کے گرداب سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ ایک میلے کی بھیڑ کے سامنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو میلے میں موجود لوگ اس کی باتوں کو سمجھنے کی بجائے اس کو پاگل سمجھتے ہیں۔ ''باغی'' ہندوستان جیسے ملک جو ذات پات اور اونچ نیچ کے گرد و غبار سے اٹا پڑا ہے اچھا درس دیتا ہے۔ مجموعے کے اگلے افسانے کا عنوان ہے 'چھپا سانپ'

'چھپا سانپ' افسانے میں پنڈت رتن شاستری کا کردار نہایت دلچسپ ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے کردار کی وجہ سے سماج میں بھگوان کی طرح پوجاتے ہیں لیکن جب گھر کی چہار دیواری میں ان کے اندر کا حیوان جاگتا ہے تو وہ بھول جاتے ہیں کہ بہو بیٹی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ ہوس میں اندھے ہو جاتے ہیں اور بہو کے ساتھ منہ کالا کرتے ہیں۔ مشتاق نے افسانے کو اپنے دل نشیں پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ فطری طور پر افسانہ کہنے

کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کا انداز بیان قاری کو باندھ کر رکھنے میں ان کی بھرپور مدد کرتا ہے۔ افسانہ 'باہر اور اندر کا منظر' میں اونچی دکان پھیکے پکوان کو مشتاق نے نہایت ہی شاندار طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ پوری کہانی مشتاق کے تجربے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ 'چہرہ چھپائے لوگ' میں مشتاق نے ایک حقیقت کو افسانہ بنایا ہے۔ آج کل کالج کا ماحول بالکل افسانے میں پیش کئے گئے منظر کے مطابق ہے اور معاشرے میں لڑکیوں کی سوچ کردار افسانے کے کرداروں کی مانند ہے۔ جب سے میں نے مشتاق کا افسانہ ''چہرہ چھپائے لوگ'' پڑھا ہے تب سے مجھے ہر چہرہ چھپانے والی لڑکی پونم ہر پریت اور فوزیہ لگتی ہے اور میں راج محمد کی طرح سوچنے لگتا ہوں کہ یہ کونسے جنگل کا رخ کرنے والی ہے۔ اور یہ سول میرے ذہن و دل کو نوچتا رہتا ہے جب تک کہ میں سر کو جھٹک کر اس سوال سے نجات حاصل نہ کرلوں۔ آپ کو بھی اپنے شہر میں چہرہ چھپاتے ہوئے لڑکیاں نوجوان کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار نظر آئیں گی ''چہرہ چھپائے لوگ'' پڑھنے کے بعد کئی سوالات آپ کو بھی بے چین کر دیں گے۔ اگر آپ کے گھر میں بھی کوئی نوجوان لڑکی ہے اور وہ بھی چہرہ چھپا کر نکلتی ہے تو شک کی بجلی کوند کر آپ کو ہلا کر رکھ دے گی۔ مشتاق نے اچھے موضوع کو افسانہ بنا کر نوجوانوں کی رہنمائی کی بھرپور کوشش کی ہے۔

مجموعے کا اگلا افسانہ ہے 'سرگوشی' سرگوشی میں خواتین کی عام بیماری ہے شک! کو مشتاق نے ایک خوبصورت افسانے کا رنگ دے کر پیش کیا ہے جو تفریح کے لئے پڑھا جاسکتا ہے۔ افسانے میں تل کا پہاڑ ہے۔ میں کچھ نہیں کہوں گا کہ آپ پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔ اس بات کا مجھے بھروسہ ہے۔ 'پانچ سال کا بن باس' میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا فنی و تخلیقی شعور معراج کمال کو پہنچ چکا ہے۔ ذلفاں بی بی اس افسانے کا نمائندہ کردار ہے جو دیہات میں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے اور بالآخر اپنے عزم و ارادے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ شرافت، محبت، دیانتداری اور مشکلات برداشت کرنے کے بعد وہ ایک اونچے عہدے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ مشتاق احمد وانی کی سحر انگیز افسانوی زبان اور پرکشش اسلوب بیان قاری کو ذہنی حظ فراہم کرنے کے ساتھ معاشرتی، ثقافتی اور جمالیاتی پہلوؤں سے بھی آگہی فراہم کرتا ہے۔

مشتاق کا تخلیقی سفر ۲۵ سالوں پر محیط ہے۔ آپ کے مجموعے میں شامل افسانوں کو میں نے غور سے پڑھا ہے۔ آپ کے تمام افسانوں میں فکر وشعور کی بالیدگی اور احساس و آگہی کا عنصر قاری کو نمایاں نظر آئے گا۔ آپ کے افسانوں کے کردار قاری کو اپنے آس پاس ہی نظر آئیں گے۔ آپ نے کرداروں کو مستعار کرنے کی لغزش نہیں کی۔ آپ کا انداز بیان کافی دلکش ودلچسپ اور فصاحت و بلاغت سے بھر پور ہے جو قاری کو زبان کی بھول بھلیوں میں نہیں بھٹکاتا بلکہ افسانے کے اختتام تک سیدھے سیدھے سفر کرواتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے 'اندر کی باتیں' میں شامل تمام افسانے چاہے سماجی ہوں، مذہبی ہوں یا تخلیقی ہوں سماج کی دکھتی رگ پر انگلی ضرور رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مشتاق کا یہ مجموعہ مقصدی اعتبار سے کافی مقبول ہوگا اور اس کی خوب خوب پذیرائی ہوگی۔ میں نے اپنے خیالات رقم کئے ہیں باقی کام تو مجموعے کی اشاعت کے بعد نقاد اور مبصر کردیں گے۔ میری دلی دعا ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی یہ کوشش یہ جہت انہیں کامیابی کی بلندیاں عطا کرے۔ آمین ثم آمین!

■❖■

ڈاکٹر عظیم راہی
(اورنگ آباد مہاراشٹر)
09423781787

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانہ 'اندر کی باتیں' کا تجزیہ

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی جموں و کشمیر علاقے کے ایک معروف افسانہ نگار ہیں اور اپنی تخلیقات کے حوالے سے ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں اپنی ایک انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ اردو فکشن میں ان کی بے پناہ دلچسپی اور شغف کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ "تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران" موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور جموں و کشمیر کے ایک ایسے اسکالر ہونے کا شرف بھی انہیں اس صدی کے اوائل میں حاصل ہوا ہے جنہیں بہت کم عمری میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'ہزاروں غم' ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۸ء میں دوسرا مجموعہ 'میٹھا زہر' منظر عام پر آ کر مقبول ہوئے ہیں۔ جو عصری اردو افسانے کے باب میں اپنی تخلیقی جہت کے امتزاج کو اردو قارئین کے سامنے اپنے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اردو فکشن کی تنقید کے کئی معتبر ناموں سے داد و تحسین حاصل کی جن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، پروفیسر عتیق اللہ اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے کے حوالے سے بحیثیت افسانہ نگار جموں یونیورسٹی میں ایم فل کا مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔ افسانوں کے ساتھ تحقیقی و تنقیدی

مضامین بھی جو مختلف ادبی رسائل وجرائد میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے ہیں ان پر مشتمل تین مجموعے 'آئینہ درآئینہ' 'اعتبار ومعیار' اور 'شعورِ بصیرت' کے نام سے شائع ہوکر مقبول ہوئے اس کے علاوہ ان کی دیگر کئی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں، جن میں بطور خاص عالمی خواتین ادیبوں پر ان کی ضخیم کتاب ''اُردو ادب میں تانیثیت'' قابل ذکر ہے اور اب ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'اندر کی باتیں' کے نام سے منصۂ شہود پر بہت جلد جلوہ گر ہورہا ہے۔ اس تازہ مجموعہ کے ٹائٹل افسانہ کا مختصر تجزیہ یہاں قارئین کی نذر ہے۔

زیر نظر افسانہ 'اندر کی باتیں' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی ایک ایسی اچھوتی تخلیق ہے جس میں انہوں نے آج کے ایک اہم سلگتے ہوئے موضوع کو قلمبند کیا ہے۔ اس افسانے میں جہاں دور حاضر کے تعلیمی اداروں میں جاری بدعنوانیوں اور ناانصافیوں کی کہانی بیان کی گئی ہے وہیں یہ افسانہ ایک قابل شخص کی ناقدری اور استحصال کی دلدوز داستان کو پیش کرتا ہے۔ اس افسانہ میں جملہ ۷ کردار ہیں۔ جن میں تین کلیدی حیثیت کے حامل ہیں اور باقی چار ثانوی نوعیت کے لیکن یہی کردار افسانے کی بنت میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ افسانہ کا مختصر جسٹ یہی ہے کہ نریش رانا ایک سیون اسٹار ہوٹل کا مالک ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار کمل کانت اس کا مخلص دوست ہے جو چھ ماہ بعد جب اس ہوٹل میں ملنے آتا ہے۔ انتہائی پریشان اور بدحال حسرت ویاس میں ڈوبا ہوا ہے۔ جو نریش رانا کے استفسار پر اپنا حال زار بیان کرتا ہے اور مثالیں دے کر پہلے اپنے غم کا احساس دلاتا ہے اور پھر اپنے 'احوال واقعی' سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کے غم کی اصل وجہ کیا ہے خود کمل کانت کی زبانی سنئے:

> ''سنئے بھیا آپ ہی کے کہنے پر میں نے دارالعلوم کے شعبۂ تاریخ میں اسسٹنٹ پروفیسر کی اسامی کے لئے فارم بھرا تھا لیکن مجھے بری طرح نظر انداز کردیا گیا ہے۔ میرا مستقبل تاریک بنادیا گیا ہے۔ یہ میرے لئے بہت بڑا سانحہ ہے۔ میرا حق بری طرح مجھ سے چھینا گیا ہے۔''

یہ اقتباس پورے افسانے کی کہانی بیان کرتا ہے اور قاری پر موضوع کی شدت کو واضح کرتا ہے۔ آگے اس کا حق کیسے چھینا گیا اور حق چھیننے والا کون ہے اس کی پوری روداد

نریش رانا کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ جو وہ کمل کانت پر ظاہر کرتا ہے اور اس کے خلاف کی گئی پلاننگ سے اسے واقف کرواتا ہے جس کے سبب اس کا حق مارا گیا ہے۔

''کمل کانت تیرے خلاف بنائی گئی پلاننگ کا مجھے پورا پتہ ہے غور سے سن تیرا حق چھیننے والا شخص شعبۂ تاریخ کا سرپرست چترنجن باسو ہے۔ میری اس سے دوستی تو نہیں البتہ اس نے مجھے اپنا دوست بنا رکھا ہے۔ اس کا اکثر میرے یہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔''

چترنجن باسو کس قبیل کا آدمی ہے اس کا اندازہ نریش رانا کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس سے اس کے کردار پر بھی مزید روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''مجھے معلوم ہے کہ جب وہ ممتحن بن کے کہیں جاتا ہے تو کال گرل بک کرواتا ہے اور ایسی مدرا کی خواہش میں رہتا ہے جس کے پینے سے آدمی کی آنکھیں دن کو ہی تارے گننے لگتی ہیں اور وجود زمین پر ڈھیر ہونے لگتا ہے۔ کمل کانت سنو، چترنجن باسو بہت چتر آدمی ہے وہ اہم سیاسی، ادبی اور سماجی شخصیات کو قابو کرنے کے لئے محفلیں منعقد کرتا ہے۔ پچاس روپے کا گلدستہ ہاتھوں میں تھما دیتا ہے۔ ڈیڑھ سو روپے کا شال کاندھوں پر ڈال دیتا ہے اور اس منافقانہ انداز سے وہ ان کے روشن ضمیر کی کلغی دبوچ لیتا ہے۔ پھر وہ اس کی بداعمالیوں پہ لب کشائی نہیں کرپاتے۔''

آج کل تعلیمی اداروں میں تقررات کے نام پر جو لوٹ کھسوٹ ہو رہی ہے اور اس میدان میں ایک طرف لین دین کا بازار گرم ہے تو دوسری سمت اس شعبہ میں رشوت خوری وبدعنوانی عروج پر ہے۔ جس کے سبب نااہلوں کے لئے پی ایچ ڈی کی ڈگری کا حصول بھی آسان ہوگیا ہے کہ ممتحن کی آؤ بھگت کر کے ڈگری ایوارڈ کرلی جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں اکثر اسکالر کو اپنا تحقیقی موضوع تک یاد نہیں رہتا ہے۔ بعد میں ایسے بوگس ڈگری ہولڈرس کالج میں لکچرار اور پروفیسر بن جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کا کردار اس افسانہ میں کھیالو رام کا ہے جو اپنے نام کی طرح خیالی نہیں حقیقی لگتا ہے اور وہ چترنجن باسو کی خدمت کر کے اور باقاعدہ

سودا طے کر کے لیکچر رشپ کے انتخاب کے لئے اپنی راہ ہموار کر لیتا ہے۔ لیکن اس قسم کے استاد کو تعلیم یافتہ کہنا حقیقی معنوں میں پڑھے لکھے افراد کی توہین کے مترادف ہے۔ یہ لوگ جامعات میں ان بیساکھیوں سے پہنچ کر طلاب کا مستقبل تاریک کر کے ملک اور سماج کو نقصان پہنچاتے ہیں اور وہیں اس سبب قابل، محنتی، ایماندار اور مستحق اسکالر کی حق تلفی ہوتی ہے جس سے قوم وملت کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ یہاں بھی چترنجن باسو اپنے اثر ورسوخ کے ناجائز استعمال اور سودے بازی کے ذریعے سلیکشن کمیٹی کے ممبران کو اپنے امیدوار کے حق میں رام کر لیتا ہے۔ آخر میں نریش رانا، کمل کانت کو ان حالات کے تناظر میں سمجھاتے ہوئے 'اندر کی باتیں' بتاتے ہوئے سچائی کا یوں اظہار کرتا ہے

> ''جب دکاندار اپنے گاہک کو ماچس کی ڈبیہ یا صابن کی ٹکیہ مفت میں نہیں دیتا ہے تو تجھے کیا اتنی بڑی اسسٹنٹ پروفیسری محض تیری ذہانت اور قابلیت کی بنیاد پر مل جاتی، تجھے پتا ہونا چاہئے دو لاکھ روپے سے یہ سودا شروع ہوا تھا اور پانچ لاکھ پہ ختم ہوا ہے۔''

یہ سن کر کمل کانت کو گہری ضرب لگتی ہے۔ اور وہ مایوسی کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ بے حد ملول واداس ہو جاتا ہے۔ اپنا انتخاب نہ ہونے پر اور حق بہ حقدار رسید نہ ملنے کے سبب اس قدر دلبرداشتہ ہو جاتا ہے کہ وہ خودکشی کرنے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ تو کبھی کسی آتنک وادی گروپ میں شامل ہو جانا چاہتا ہے اور انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنی ساری کتابوں کو دریا برد کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا دوست نریش رانا اسے ہمت دیتا ہے دلاسہ و تسلی کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیتا ہے کہ وہ پرماتما کے آگے ہاتھ اٹھائے اور ۲۱ دنوں کا جاپ کرے اور بھگوان سے مانگتا رہے اس کی مراد ضروری پوری ہوگی۔ کمل کانت کی آہوں اور کراہوں کا یہ اثر ہوتا ہے کہ جاپ پورا ہوتے ہی اسے پتہ چلتا ہے کہ چترنجن باسو کے پورے جسم میں بے حسی کی بیماری پھیل گئی ہے۔ یہی افسانہ کا نقطہ عروج ہے کہ چترنجن باسو کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے اور اسے آخر کوڑھ کی بیماری لگ جاتی ہے۔ میری نظر میں یہ کوڑھ صرف چترنجن باسو جیسے لوگوں کو نہیں لگی بلکہ ایسے افراد کی وجہ سے پورے دار العلوم کو لگ گئی ہے۔ اور پورے سماج کو اس لاعلاج بیماری نے گھیر لیا ہے۔ ورنہ کبھی مستحق امیدوار کا نہ

استحصال ہوتا اور نہ ہی حق داروں کی یوں حق تلفی ہوتی اور تعلیم دینے والے کے مقدس اداروں میں رشوت خوری اور بدعنوانی کی بیماریاں کبھی نہیں پھیلتیں، جس کے سبب نئی نسل کا مستقبل کس قدر خراب ہوا ہے۔ اس کا تصور کرنا بھی اب محال لگتا ہے۔ یہ ایک ایسا سلگتا ہوا سوال ہے جو افسانہ نگار نے قاری کے ذہن میں پیدا کر دیا ہے۔ اسے مسلسل کچوکے لگاتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

دراصل زیر نظر افسانہ افسانہ نگار کے دل کی آواز لگتی ہے۔ چونکہ مشتاق احمد وانی درس وتدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہیں اس شعبے میں آج کل بدعنوانی، بداخلاقی اور حق تلفی کا جو نظام رائج ہو گیا ہے شاید وہ بھی اس کا شکار ہوئے ہیں۔ اور اس اذیت ناک کرب کو جھیلا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اندرون کا کرب بڑے دردمندانہ انداز میں اکثر جگہ ابھر آیا ہے۔ جو ذاتی نوعیت کا ہو کر بھی اس ماحول میں رہنے والے ہر شخص کو اپنا لگتا ہے جسے اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس صورت حال کا پورا منظرنامہ افسانہ پڑھنے کے بعد قاری کی آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا ہے جو اسے متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

الغرض مختصر مگر اہم کرداروں کے ذریعے برجستہ مکالموں اور چست پلاٹ کے ساتھ مشتاق احمد وانی نے ایک اچھا افسانہ تخلیق کیا ہے۔ افسانہ کی زبان آسان سادہ اور رواں دواں ہے۔ بہرکیف یہ افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک عمدہ کہانی کو موثر انداز میں پیش کرتا ہے جس میں زبردست عصری حسیت ہے اور عصری آگہی کا ادراک بھی۔ افسانہ میں تمام اجزائے ترکیبی بدرجہ اتم موجود ہیں جو پڑھنے والے کی دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں۔ جو ہر اچھے افسانہ کی ایک بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے مشتاق احمد وانی کا یہ ایک قابل ذکر افسانہ ہے جو تعلیمی اداروں کے اندر کی بہت ساری باتوں کو منظر عام پر لاتا ہے۔

آخر میں مشتاق احمد وانی کو اس کامیاب تخلیق پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد کے ساتھ اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

■❖■

ابو بکر عباد
(شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)
09810532735

مشتاق احمد وانی

سماجی، معاشرتی اور حالاتِ حاضرہ کے افسانے نگار

فکشن ہر دور میں اردو کی پسندیدہ، مقبول اور ہر دل عزیز صنف رہی ہے۔ جب سائنسی ایجادات نے تفریح کے نئے نئے، سستے اور حیرت انگیز آلات ہمارے گھروں اور ہماری جیبوں میں نہیں پہنچائے تھے تو زندگی کی بھاگ دوڑ اور بے طرح مصروفیت سے انسان فرصت کے چند لمحات نکال کر فکشن کا مطالعہ کر لیا کرتا تھا؛ کہ پڑھے لکھے حضرات اور خواندہ لوگوں کی تفریح کا یہ واحد ذریعہ تھا جو قلب و ذہن کو سکون و طمانیت شعور کو بالیدگی اور روح کو فرحت و تازگی بخشتا تھا۔ آج کی اس تیز رفتار زندگی اور تکنیکی دور میں بھی فکشن کی پذیرائی اور مقبولیت باقی ہے اور کافی حد تک اسے مسرت و بصیرت عطا کرنے کا مقدس اور محبوب وسیلہ تصور کیا جاتا ہے۔

اردو فکشن بالخصوص افسانے کی اہمیت یہ ہے کہ صرف ملک کے طول و عرض میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف خطوں اور تقریباً سبھی طبقوں میں شوق سے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ اردو افسانہ کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اس کے گیسو سنوارنے والوں میں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں اور اس کے فنی، موضوعاتی اور تکنیکی تجربوں کو فروغ دے رہے ہیں۔ ایسے اساتذہ کی ایک طویل

فہرست ہے جو درس وتدریس اور تحقیق وتنقید میں منہمک رہنے اور سیمینارز اور کانفرنسوں میں شرکت کے ساتھ ساتھ فکشن کی تخلیق میں بھی مصروف ہیں۔ انہی افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی صاحب۔ مشتاق احمد وانی کا تعلق جنت نظیر کشمیر کی وادی سے ہے، کشمیر خود اپنی خوبیوں اور خوبصورتیوں کی بنا پر افسانوی دنیا سے کسی طور کم نہیں ہے۔

مشتاق صاحب بنیادی طور پر ایک استاذ ہیں اور تحقیق وتنقید سے سروکار رکھنے کے علاوہ کافی عرصے سے افسانے بھی تخلیق کر رہے ہیں۔ مختلف موضوعات پر نصف درجن کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جن میں ''ہزاروں غم'' (۲۰۰۱ء) اور ''میٹھا زہر'' (۲۰۰۸ء)، افسانوی مجموعے بھی شامل ہیں۔

مشتاق احمد وانی صاحب سماجی اور معاشرتی موضوعات کے علاوہ حالات حاضرہ کے مسائل اور اپنے ارد گرد کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد فکر واحساس کو کہانیوں کے قالب میں ڈھال کر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور انھیں سوچ پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ایک مخصوص مثبت اور اصلاحی پہلو ہوتا ہے جسے ان کے طرز خاص سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ امید ہے کہ ان کے پہلے افسانوں کے مجموعوں کی مانند اس مجموعے ''اندر کی باتیں'' کو بھی اردو حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

■❖■

حقانی القاسمی (نئی دہلی)
09891726444

مشتاق احمد وانی ایک مشّاق کُوزہ گر

مشتاق احمد وانی نے ایک ساتھ کئی مشعلیں جلا رکھی ہیں۔ تحقیق، تنقید اور تخلیق —ان تینوں کے طور وطرز الگ ہیں مگر ایک ہی 'مرکزہ' سے جڑے ہوئے ہیں۔

مشتاق وانی نے اپنی ریاضت، محنت، ژرف نگاہی، جاں سوزی، عرفاں و آگہی سے اس مثلث کو مقدور بھی معتبر کیا ہے اور ان تینوں منطقوں میں اپنی ایک الگ پہچان قائم کی ہے۔ اُن کی بنیادی شناخت تو ایک ناقد اور محقق کی ہے مگر اُنہوں نے تخلیقی میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ 'افسانوی کائنات' سے اُن کے ذہن کا بہت مضبوط اور گہرا رشتہ ہے۔ اسی لئے انہوں نے تنقید اور تحقیق کے متوازی اُس تخلیقی عمل کو بھی جاری رکھا ہے مقتدر جرائد و رسائل میں اُن کے افسانوں سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ ان افسانوں میں ان کے ذہن اور داخلی احساس کے سارے رنگ نظر آتے ہیں۔ زندگی کے وہ تجربات وحوادث جن سے وہ گزرے ہیں، وہ تمام تجربے ان کے افسانوں کا حصہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے مشاہدات کو اپنے تخلیقی تجربے میں ڈھالا ہے۔ آج کی زندگی کے جو موضوعات، مسائل ہیں، اُن کو اپنے افسانوں میں بھی برتنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے افسانوں میں کہیں کہیں شخصی یا سوانحی بیانیے (Narratives) بھی آگئے ہیں۔ ''اندر کی باتیں''، کردار کی تبدیلی کے ساتھ اُن کا ایک ایسا شخصی بیانیہ ہے یا ایسی سرگزشت جس میں فنکار نے اپنا الٹرا ایگو بنا کر اپنی ہی زندگی کے تجربوں کو افسانے کی شکل دی ہے:

"مکمل کانت! جب دکاندار اپنے گاہک کو ماچس کی ڈبیہ یا صابن کی ٹکیہ مفت میں نہیں دیتا ہے تو تجھے کیا اتنی بڑی اسسٹنٹ پروفیسری محض تیری ذہانت اور قابلیت کی بنیاد پر مل جاتی تجھے پتا ہونا چاہئے دولاکھ روپے سے یہ سودا شروع ہوا تھا اور پانچ لاکھ پہ ختم ہوا ہے۔"

(افسانہ "اندر کی باتیں")

یہ آج کی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ تعلیمی مافیا پر ایک گہرا طنز ہے۔ جامعات میں تقرری کے تعلق سے جو عام تصورات ہیں، اس کی تصدیق ہوتی ہے، دھاندلی، ہنگرم بازی، جوڑتوڑ — پیسہ، یہ وہ حقیقتیں ہیں جو اس افسانہ کا حصہ بنی ہیں۔ مشتاق احمد وانی نے اس پورے ریکٹ کا پردہ فاش کیا ہے۔ جو تعلیمی نظام میں ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ افسانہ تقرری میں عدم شفافیت پر سوالیہ نشانہ قائم کرتا ہے:

"رانا صاحب! اگر آپ یہ بھی نہیں چاہتے ہیں تو پھر میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میں اپنی تمام کتابیں اور رسائل کہ جو میرا عمر بھر کا اثاثہ ہے کسی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا میں پھینک آؤں، تاکہ آئندہ مجھے کسی دارالعلوم کے انٹرویو کے لئے یہ منوں بوجھ اپنے کندھوں پر نہ اُٹھانا پڑے۔" (افسانہ "اندر کی باتیں")

کہانی کے کردار کا یہ ردّعمل جامعات میں تقرری کے طریقۂ کار کے خلاف سخت احتجاج ہے یہ ایک اقتباس پس پردہ کے سچے کھیل کو پوری طرح بے نقاب کرتا ہے۔

مشتاق احمد وانی کی کہانیوں میں اس طرح کے طنز اور تلخیوں کی زیریں لہریں موجود ہیں۔ مگر مشتاق احمد وانی نے اپنی فطری معصومیت کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ اُن کی ہر کہانی میں وہ معصومیت دھیرے سے در آئی ہے۔ انہوں نے دہشت میں محبت، نفرت میں اخوت کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ایک شورش زدہ، شدت پسند ماحول نے بھی اُن کے بنیادی حلیے کو تبدیل نہیں کیا ہے۔ بلکہ منفی ماحول سے بھی انہوں نے مثبت اثر قبول کیا ہے۔

مشتاق وانی کی کہانیوں پر اُن کے شورش زدہ ماحول کا معکوسی اثر ہے۔ اُن کی کہانیوں میں زیریں سطح پر ٹرانسفارمیشن کا عمل جاری وساری ہے۔ خارجی دہشت داخلی

محبت میں تقلیب کا عمل اُن کی کہانیوں کا جواز ہے۔ خواب اور خوف کے تصادم اور کشمکش میں بھی اُن کا داخلی ذہن خواب کو قبول کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیاں ساحر لدھیانوی کی طرح خواب بننے کی بات کرتی ہیں۔ ایک معصومانہ تحیّر اُن کی کہانیوں کا تخلیقی عُنصر ہے۔ اُن کی کہانیوں کے کردار یگانگت، اخوت، یکجہتی اور اتحادی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کہانیوں میں مشتاق وانی کا صالح اور صحت مند ذہن پوری کلیت کے ساتھ متحرک اور فعال نظر آتا ہے۔ مشتاق وانی کی کہانیاں زبان کی ژولیدگی، ابہام اور مہملیت سے پاک ہیں۔ وہ صاف ستھری اور ترسیلی زبان استعمال کرتے ہیں —— نہ زبان نہ کردار اور نہ ہی پلاٹ میں جھول ہے۔ وہ سیدھے سادے بیانیہ پر یقین رکھتے ہیں۔ زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے آگاہ ہیں۔ اس لئے اُردو کے بنیادی اُسلوب سے منحرف نہیں ہوتے —— وہ فلسفیانہ مباحث اور ادق مسائل کو بھی بڑی فن کاری اور خوب صورتی سے اپنی کہانیوں کا جزو بناتے ہیں مگر کہیں بھی ان نظریات کا بوجھل پن ان کی زبان کی نزاکت و لطافت کو مجروح نہیں کرتا۔

مشتاق وانی ایک مشتاق کوزہ گر کی طرح اپنی کہانیوں کی مٹی کو اپنے جادوئی لمس سے اس طرح خوب صورت رنگ رُوپ دیتے ہیں کہ ان کی کہانیوں کی خاموشیاں بھی بول اُٹھتی ہیں:

> ”وہ دیکھو ہمارے شہر کے امیر ترین آدمی لالہ مدن گوپال آج کس بے سروسامانی کے عالم میں ہیں۔ یہ وہی مدن گوپال ہیں جو کئی فیکٹریوں، کارخانوں اور گاڑیوں کے مالک تھے۔ لیکن آج جسم خور کیڑے نے ان کا کیا حال بنا رکھا ہے۔“ (افسانہ ”جسم خور کیڑا“)

اولڈ ایج پر مبنی یہ کہانی فلم ”باغبان“ کی یاد دلا دیتی ہے۔ بوڑھے جس درد، کرب اور اذیت سے گزرتے ہیں۔ اس کو لئے سیدھے سادے انداز میں بیان کیا ہے۔ آج یہ معاشرتی مسئلہ نہ صرف ہمارے ذہن بلکہ ضمیر کو بھی جھنجھوڑتا ہے۔ یہ سماجی نفسیات اور ساگی سے جڑا ہوا مسئلہ ہے۔ یہ اقدار کے زوال کا مسئلہ بھی ہے اور قدروں کی تبدیلی کا اشاریہ بھی۔ مشتاق وانی نے اس طرح کے سماجی مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے اور ہمارے ذہن اور ضمیر پر دستک دے کر ہمیں بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک فن کار کا جو

معاشرتی فریضہ ہے اُس کی ادائیگی مشتاق وانی نے بہتر طور پر کی ہے۔ اُنھوں نے اپنے دل کی بات کو زبان دی ہے۔ منور بدایونی کی طرح ان کا مدعا بس اتنا ہے کہ:

پردۂ دل میں جو نغمے تھے زباں تک پہنچے
دیکھئے اب مری آواز کہاں تک پہنچے

اس آواز میں درد بھی ہے، کرب بھی، محرومی بھی، شکستگی بھی، مگر یہ دل کی آواز ہے اس لئے رائیگاں نہیں جائے گی۔ اس آواز کے حلقۂ اثر میں سماج بھی آئے گا اور شورش زدہ سیاست بھی —— مشتاق احمد وانی کی یہ افسانوی آواز اپنا اعتبار قائم کرنے میں کامیاب ہوگی —— اتنا مجھے یقین ہے۔

■❖■

ڈاکٹر سید اختیار جعفری
ڈائریکٹر مرزا غالب ریسرچ اکیڈمی، آگرہ
09897871667

افسانوں میں شعری لب ولہجہ کا ترجمان مشتاق وانی

اکیسویں صدی میں اُردو افسانہ نئی صورت حال سے نبرد آزما ہے۔ گزشتہ ربع صدی میں دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ ہمارے معاشرے کو ایسے مسائل کا سامنا ہے جن کے بارے میں کسی نے سوچا نہیں تھا۔ سائنس کی بے تحاشا ترقی، جسمانی آرام وآسائش کے بے شمار اسباب، تباہ کن اقتصادی تفاوت، جنسی انارکی، عورتوں کے خلاف روز اضافہ پذیر جنسی معاملے، نفرت آمیز گھریلو تشدد، گھروں میں ہی اپنوں کی زد میں جنسی استحصال کا شکار خواتین، ناقابل برداشت عریانیت، ہر سطح پر موجود کرپشن، نفرت آمیز سیاست، بے تحاشہ بڑھتی مہنگائی، مذہب کا کاروباری استعمال، دہشت گردی اور نکسل واد سے لے کر ٹارگٹ کلنگ، ایڈس، بردہ فروشی اور سرکاری غارت گری تک بے شمار مسائل ہیں جن میں پھنس کر آج کا انسان سخت ذہنی تناؤ کا شکار ہے۔ اس کا ماضی اسے سکون نہیں دیتا۔ وہ حال سے سخت غیر مطمئن ہے اور اس کا مستقبل بھی مایوس کن۔ ان کے علاوہ بھی کتنی ہی ایسی باتیں ہیں جن کی ہمارے معاشرے کو کانوں کان خبر نہیں۔ بعض موانع ایسے بھی ہیں کہ ہماری آبادی کا ۲۰، ۲۵ فیصد حصہ جو باخبر اور خواندہ ہے، اس تک بھی بہ وجوہ بہت سی خبروں کی رسائی نہیں۔ تاہم تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال باخبر شاعر یا افسانہ، نگار جب ایسی خبروں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے

انسانی معاشرے کی بھلائی اور کائنات کی بقا کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے لوگوں تک پھیلایا جائے تو موانع کے باوجود کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ اور اب تو کچھ عرصہ سے ع

''دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ''

والا معاملہ درپیش ہے۔ ''قطرے کو گہرے ہونے تک'' بڑے بڑے ہفت خواں کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن تخلیقی صلاحیت والا افسانہ نگار نہایت درجہ ہنر مندی سے فنی پردے میں چھپا کر وہ خبر یا وہ خاص بات ادب کے ذریعے لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اُردو کے بعض افسانہ نگار نہایت درجہ ہنر مندی اور بڑی نیک نیتی اور مستعدی سے اس نیک کام پر لگے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی باہنر، مستعد اور وسیع النظر افسانہ نگاروں میں مشتاق وانی بھی شامل ہیں۔ جن کا تازہ تخلیقی شاہ کار ''اندر کی باتیں'' اس وقت آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔

''اندر کی باتیں'' کا خالق مشتاق وانی جنت نظیر کشمیر کے فرزند ہیں۔ اس لحاظ سے عام لوگوں کے مقابلے ان کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل دوسروں سے کچھ زیادہ پیچیدہ ہیں۔ یہ پیچیدگی ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس پیچیدگی کے اظہار کا ان کا طریقہ بے حد سادہ اور سپاٹ ہے۔ انہوں نے فنی چابک دستی اور ہیئت کے حوالے سے جو روایتی افسانے تخلیق کیئے ہیں اُن میں ایک مرکزی نقطۂ نظر قائم کر کے واقعاتی تانا بانا بُنا ہے، اسی تانے بانے کے ذریعے انہوں نے واقعات، کردار اور مسائل پر کاری وار کیئے ہیں۔ ان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ''افسانہ برائے افسانہ'' نہیں لکھتے۔ وہ بے مطلب کبھی بھی اور کچھ بھی لکھنے کے قائل نہیں:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

وہ بہت سوچ سمجھ کر موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ حقیقت پسندوں کی طرح ''تھیم'' کا انتخاب کریں۔ لیکن جہاں تک تھیم کا تعلق ہے، وہ آخر تک تھیم کو نبھانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

عام طور پر مشتاق وانی کے افسانے سپاٹ اور امکانی نظر آتے ہیں۔ وہ بیانیہ میں گھماؤ پھراؤ کے عادی نہیں۔ سیدھی سادی بات واضح اسلوب میں قاری کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس کے لئے وہ عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ واقعات کی رفتار معمولی رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقی اپج انہیں زیادہ اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتی۔ بلکہ کبھی کبھی حالات اتنی تیزی سے تغیر پذیر ہوتے ہیں کہ گویا:

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

لیکن سرعت اور تغیر کے باوجود وہ تھیم اور اپنے پلاٹ پر مضبوط گرفت بنائے رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے افسانے ''سرگوشی'' پڑھ ڈالئے۔ دو نکمے، گھر بدر، اوباش اور شیطان صفت نوجوان دو پیار کرنے والوں میں کیسے پھوٹ ڈال دیتے ہیں اور پھر کیسے مزے لیتے ہیں یہ غور کرنے کی بات ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات جو افسانہ نگار بین السطور میں کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ پیار میں جسمانی تلذذ سے زیادہ اہمیت اعتبار رو معیار کی ہے۔ ذرا سی بات میں تمام تعلقات منقطع کر دینا نہ تو عشق میں ممکن ہے نہ مناسب۔ اس افسانے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صنعتی دور کے جنسی یا جسمانی لگاؤ کو عشق سمجھ لینے پر اعتراض کیا گیا ہے۔ چوتھی خاص بات یہ ہے کہ ان باتوں کو بیان کرنے کے لئے افسانہ نگار صنعتوں، استعجاب، تجرید، آرٹ یا استعاروں و تشبیہوں کا استعمال نہیں کرتا بلکہ صنعتوں، الفاظ اور سپاٹ بیانیہ سے کام لیتا ہے۔ اس تکنیک کا وہ اکثر استعمال کرتے ہیں۔

تخلیق کا گہرا تعلق تنقید سے ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی چونکہ بذاتِ خود تنقید نگار اور محقق بھی ہیں۔ تنقید کا تعلق ادبی تخلیق سے ہے اور ادبی تخلیق کا تعلق فکر، جذبے، مشاہدے، احساس، تجربے اور جمالیاتی اظہار پر قدرت سے ہے۔ یہ تمام چیزیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور تبدیل ہوتی رہیں گی اس کے لئے نقاد اور خالق کو اپنا ذہن ہمیشہ کھلا رکھنا چاہئے۔ اس میں ردو قبول کی صلاحیت سب سے زیادہ ہونا چاہئے۔ اگر تنقید نگار خشک پتے کی طرح ہوا کے رُخ پر اُڑنے لگے تو ادبی تفہیم بے سمتی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ نئے تنقید نگاروں بہ شمول جاوید رحمانی، لئیق رضوی، ظہیر رحمتی، اطہر مسعود، رضا حیدر اور ڈاکٹر مشتاق وانی میں یہ مثبت رجحان موجود ہے۔

مشتاق وانی محاکات اور منظر کشی پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا معرکتہ

انسانی معاشرے کی بھلائی اور کائنات کی بقا کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے لوگوں تک پھیلایا جائے تو موانع کے باوجود کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ اور اب تو کچھ عرصہ سے ع

''دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ''

والا معاملہ درپیش ہے۔ ''قطرے کو گہرے ہونے تک'' بڑے بڑے ہفت خواں کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن تخلیقی صلاحیت والا افسانہ نگار نہایت درجہ ہنرمندی سے فنی پردے میں چھپا کر وہ خبر یا وہ خاص بات ادب کے ذریعے لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اُردو کے بعض افسانہ نگار نہایت درجہ ہنرمندی اور بڑی نیک نیتی اور مستعدی سے اس نیک کام پر لگے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی باہنر، مستعد اور وسیع النظر افسانہ نگاروں میں مشتاق وانی بھی شامل ہیں۔ جن کا تازہ تخلیقی شاہ کار ''اندر کی باتیں'' اس وقت آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔

''اندر کی باتیں'' کا خالق مشتاق وانی جنت نظیر کشمیر کے فرزند ہیں۔ اس لحاظ سے عام لوگوں کے مقابلے ان کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل دوسروں سے کچھ زیادہ پیچیدہ ہیں۔ یہ پیچیدگی ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس پیچیدگی کے اظہار کا ان کا طریقہ بے حد سادہ اور سپاٹ ہے۔ انہوں نے فنی چابک دستی اور ہیئت کے حوالے سے جو روایتی افسانے تخلیق کیئے ہیں اُن میں ایک مرکزی نقطۂ نظر قائم کر کے واقعاتی تانا بانا بُنا ہے، اسی تانے بانے کے ذریعے انہوں نے واقعات، کردار اور مسائل پر کاری وار کئے ہیں۔ ان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ''افسانہ برائے افسانہ'' نہیں لکھتے۔ وہ بے مطلب کبھی بھی اور کچھ بھی لکھنے کے قائل نہیں:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

وہ بہت سوچ سمجھ کر موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ حقیقت پسندوں کی طرح ''تھیم'' کا انتخاب کریں۔ لیکن جہاں تک تھیم کا تعلق ہے، وہ آخر تک تھیم کو نبھانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

عام طور پر مشتاق وانی کے افسانے سپاٹ اور امکانی نظر آتے ہیں۔ وہ بیانیہ میں گھماؤ پھراؤ کے عادی نہیں۔ سیدھی سادی بات واضح اسلوب میں قاری کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس کے لئے وہ عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ واقعات کی رفتار معمولی رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقی اپچ انہیں زیادہ اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتی۔ بلکہ کبھی کبھی حالات اتنی تیزی سے تغیر پذیر ہوتے ہیں کہ گویا:

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

لیکن سرعت اور تغیر کے باوجود وہ تھیم اور اپنے پلاٹ پر مضبوط گرفت بنائے رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے افسانے ''سرگوشی'' پڑھ ڈالئے۔ دو نکمے، گھر بدر، اوباش اور شیطان صفت نوجوان دو پیار کرنے والوں میں کیسے پھوٹ ڈال دیتے ہیں اور پھر کیسے مزے لیتے ہیں یہ غور کرنے کی بات ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات جو افسانہ نگار بین السطور میں کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ پیار میں جسمانی تلذذ سے زیادہ اہمیت اعتبار رو معیار کی ہے۔ ذرا سی بات میں تمام تعلقات منقطع کر دینا نہ تو عشق میں ممکن ہے نہ مناسب۔ اس افسانے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صنعتی دور کے جنسی یا جسمانی لگاؤ کو عشق سمجھ لینے پر اعتراض کیا گیا ہے۔ چوتھی خاص بات یہ ہے کہ ان باتوں کو بیان کرنے کے لئے افسانہ نگار صنعتوں، استعجاب، تجرید، آرٹ یا استعاروں و تشبیہوں کا استعمال نہیں کرتا بلکہ صنعتوں، الفاظ اور سپاٹ بیانیہ سے کام لیتا ہے۔ اس تکنیک کا وہ اکثر استعمال کرتے ہیں۔

تخلیق کا گہرا تعلق تنقید سے ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی چونکہ بذات خود تنقید نگار اور محقق بھی ہیں۔ تنقید کا تعلق ادبی تخلیق سے ہے اور ادبی تخلیق کا تعلق فکر، جذبے، مشاہدے، احساس، تجربے اور جمالیاتی اظہار پر قدرت سے ہے۔ یہ تمام چیزیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور تبدیل ہوتی رہیں گی اس کے لئے نقاد اور خالق کو اپنا ذہن ہمیشہ کھلا رکھنا چاہئے۔ اس میں ردو قبول کی صلاحیت سب سے زیادہ ہونا چاہئے۔ اگر تنقید نگار خشک پتے کی طرح ہوا کے رُخ پر اُڑنے لگے تو ادبی تفہیم بے سمتی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ نئے تنقید نگاروں بہ شمول جاوید رحمانی، لئیق رضوی، ظہیر رحمتی، اطہر مسعود، رضا حیدر اور ڈاکٹر مشتاق وانی میں یہ مثبت رجحان موجود ہے۔

مشتاق وانی محاکات اور منظر کشی پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا معرکتہ

الآراء افسانہ ''اندر کی باتیں'' اس بات کا غماز ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں دینا جہان کی جزئیات بھرنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ انے وسیع مطالعہ کو اپنے کرداروں کے ذریعے سائنس، آرٹ، سنگیت یا فلسفے پر بحث کرتے نظر نہیں آتے۔ وہ گول مول الفاظ بھی نہیں لکھتے۔ وہ ذو معنیٰ الفاظ سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ قاری کو تذبذب میں نہیں ڈالتے۔ منٹو کی طرح ان کے افسانوں کے انجام کا پتہ آخر تک نہیں چلتا اور قاری تذبذب واشتیاق کی حالت میں ڈوبا رہتا ہے۔ اختتام یا کلائمکس تک پہنچ کر اسے ویسا ہی جھٹکا لگتا ہے، جیسا منٹو کے افسانوں میں۔ فرق دونوں میں ادب کے سلسلے میں ان کے نقطۂ نظر کے باعث ہے۔ منٹو کی طرح ان کی اکثر کہانیوں میں جہاں انہوں نے سماج کی کسی برائی کی تصویر کشی کی ہے۔ بے پناہ غصہ ہے۔ یا کھسیاہٹ ہے۔ وہ اپنے غصے یا کھسیاہٹ کو دباتے نہیں بلکہ کرداروں کے ذریعے الفاظ میں انڈیل دیتے ہیں۔ وہ دراصل انسانی اخلاق کی برتری کے قائل ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر مشتاق وانی کی ایک اور افسانوی خصوصیت بیان کر کے یہ مضمون ختم کردوں گا۔ حالانکہ مشتاق وانی اوّل وآخر ایک نثر نگار ہیں۔ لیکن کہیں کہیں دل کے کسی گوشے میں وہ شاعر بھی ہیں۔ خواہ انہوں نے ایک بھی غزل یا نظم نہ کہی ہو لیکن ان کے افسانوں میں جہاں کہیں قدرت کے خوبصورت مناظر، حسین عورت یا مرد کا ذکر آتا ہے، ان کے بیان سے جیسے شاعری پھوٹ کر بہنے لگتی ہے۔ ان کی تشبیہیں ایسی نادر اور دل کو چھو لینے والی ہوتی ہیں کہ اچھے اچھے شاعر کو بھی پسینے آجائیں۔ شاعرانہ فقرے ایک خوبصورت سماں کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں۔

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر میرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

■❖■

دیپک کنول (ممبئی)
09322640792

مشتاق احمد وانی اوران کے افسانے

زندگی اور کہانی لازم وملزوم ہیں۔ یعنی کہانی کوزندگی سے اور زندگی کو کہانی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی بات کوکسی مفکر نے یوں بیان کیا ہے کہ 'کہانی کے پس پردہ زندگی دھڑکتی ہے۔' گویا کہانی کوئی وقت گزاری یا چٹخارے کی چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کی سچائیوں کی حقیقی تصویر پیش کر کے اس کی بہت سی سچائیوں سے پردہ ہٹاتی ہے جوکہ عام انسانوں کے تخیل سے پرے ہے۔

ایک سچا فن کار جس عہد میں سانس لیتا ہے اس کے اثرات اس پر مرتب ہونا لازمی ہیں۔ ہمارے اردگرد نیکی اور بدی کی قوتوں میں جو کشاکشی دیکھنے کوملتی ہے اسی کے پیچ وخم سے کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی کہانیاں اسی پس منظر کی پیداوار ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں خطیبانہ، واعظانہ اور ناصحانہ انداز اختیار نہیں کرتے بلکہ سیدھے سادے طریقے کے ساتھ بیانیہ انداز میں سماج میں پھیلی کمزوریوں اور اچھائیوں کوواضح کرتے ہیں۔ اَن کی کہانیوں کے کردار ہماری روزمرہ زندگی کا تجزیہ کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر افسانہ 'فتنہ' لیجئے۔ ایک طرف جہاں انسانی فہم وادراک نے اونچی زقند لگا کے آسمان کو چھولیا، وہیں دوسری طرف وہ اخلاقی پستیوں کی گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔ یہ رفعت وابتذال کا سلسلہ تھما نہیں۔ جن چیزوں سے وہ محظوظ اور مستفید ہوتا رہا انہی چیزوں نے اسے فحاشی، مادہ پرستی، بداخلاقی اور بے راہ روی کی طرف دھکیل دیا۔ موبائل کی ہی

مثال لیجئے کہ آئے دن ایس ایم ایس کی شکایتیں سننے کو ملتی ہیں۔ موبائل جہاں رحمت بن کر آیا وہیں اس نے نئی نئی بدعتوں اور مصیبتوں کو جنم دیا۔ مولوی نعیم الدین جس نے اپنی زندگی اللہ کی بندگی میں گزاری۔ عبادت اور پرہیز گاری کو انہوں نے اپنی زندگی کا شعار بنالیا۔ وہی مولوی نعیم دین جب موبائل کی موہ میں پڑ گئے تو اسی آلۂ مصیبت نے ان کی برسوں کی عبادت ایک پل میں مٹی میں ملا کے رکھ دی۔ ایک رنگ ٹیون نے بھری محفل میں انہیں خجل وخوار کر کے چھوڑا۔ ملاحظہ کیجئے

> ''اب مولوی نعیم الدین زبانی خطبہ پڑھ رہے تھے اور تمام نمازی بڑی عظمت کے ساتھ سر جھکائے خطبہ سن رہے تھے۔ وہ جونہی خطبے سے فارغ ہوئے تو سب نمازی صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ چورا ہے والی مسجد کی چاروں منزلیں نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ امام نے تکبیر اولیٰ کہی تو تمام مقتدیوں نے دونوں ہاتھ کانوں کی لو تک اٹھائے اور ہاتھ باندھ کے قیام میں مولوی نعیم الدین کی دلگداز قرأت کو کلام الٰہی کی عظمت کے ساتھ سننے لگے۔ پہلی رکعت کے بعد جب مولوی نعیم الدین دوسری رکعت میں الحمد شریف پڑھنے کے بعد سورہ رحمن پڑھنے لگے تو ان کے رنگین موبائل پر یہ گانا بجنے لگا ''جیون میں پیا تیرا ساتھ رہے، ہاتھوں میں تیرے میرا ہاتھ رہے۔'' (افسانہ 'فتنہ')

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ فلم، ٹی وی اور موبائل نے ہماری اخلاقی قدروں کو ہی غارت نہیں کیا بلکہ ہمیں اپنوں سے بھی بیگانہ کر دیا۔ رشتے بے معنی بن کر رہ گئے۔ عورت جسے ہر دین دھرم میں مقدس شے سمجھا جاتا تھا اسی کے تقدس کو پامال کیا گیا۔ عورت لطف ولذت کا سامان بن کر رہ گئی۔ میگھ ناتھ جس نے اپنی زندگی شرافت وسادگی سے جینے کا عزم کیا تھا جو پرائی عورت کو شجر ممنوعہ سمجھتے تھے جو سماج میں پھیلی گند وغلاظت سے بے حد دکھی اور پریشان تھے۔ معاشرے میں بڑھتی بے راہ روی اور فحاشی کو دیکھ کر وہ کڑھ کے رہ جاتے تھے۔ ایک بار وہ ٹہلنے کے لئے جب گھر سے نکلے تو قدم قدم پر حیا سوز مناظر دیکھ کر وہ اتنے

دکھی ہوئے کہ بھاگتے بھاگتے وہ ایک سنیما ہال کے سامنے سے گزرے جہاں بورڈ پر لکھا تھا کہ یہ فلم صرف بالغوں کے لئے ہے۔ انہوں نے یہ سوچ کر ٹکٹ خریدا کہ شاید کوئی بھگتی گیان کی فلم ہوگی سو وہ فلم تھیٹر میں گھس گئے۔ فلم چلی تو پہلا منظر یوں تھا:

"پہلے منظر میں ایک شادی شدہ عورت کو ایک غیر شادی شدہ نوجوان سے محبت کرتے دکھایا گیا تھا۔ دوسرے منظر میں ایک تالاب میں ان دونوں کو بالکل عریاں حالت میں دکھایا گیا اور پھر تیسرا منظر ناقابل بیان۔ میگھ ناتھ سنیما ہال میں تاریکی میں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اب انہوں نے آنکھیں بند نہیں رکھی تھیں بلکہ کھلی آنکھوں سے برابر سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ ڈیڑھ سو کا ٹکٹ خرید کر بالکونی میں جا کر بیٹھے تھے۔ تیسرے منظر نے ان کے پورے وجود میں بہت زیادہ حرارت پیدا کر دی تھی جو بعد میں آتش فشاں کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ پورے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب میگھ ناتھ ہال سے باہر آئے تو وہ انتہائی مایوس تھے۔ ان کی آنکھوں نے آج جو کچھ دیکھا تھا وہ انہوں نے زندگی میں آج تک نہیں دیکھا تھا۔ آج ان کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ ان کے جسم میں جو اتھل پتھل ہوئی تھی وہ انہیں بار بار مایوس کر رہی تھی۔ وہ کیا سوچ کر سنیما ہال میں آئے تھے اور کتنی قیمتی چیز لٹا کے یہاں سے جا رہے تھے۔ وہ یوں محسوس کر رہے تھے کہ جیسے آج ان کی آنکھوں نے زنا کیا ہو۔"

(افسانہ 'آنکھوں کی عصمت دری')

کہانیوں کے یہ چند اقتباسات موجودہ دور کے ابھرتے ہوئے جواں سال افسانہ نگار مشتاق احمد وانی کے ہیں۔ مشتاق احمد وانی ایسے محبان اردو میں سے ایک ہیں جو اپنے لوح وقلم سے گلشن ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ ملک کے رسالوں اور جریدوں میں تواتر سے چھپ رہے ہیں۔ وانی صاحب جموں وکشمیر کے گرم خطے جموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو گرم علاقوں کے باسی ہوتے ہیں ان کا دماغ ہمیشہ گرم رہتا

ہے۔وانی صاحب سے میں جب بھی ملا تو انہیں بہت ہی مخلص اور ملنسار پایا۔

وہ مزاج سے بھلے ہی نرم اور ملائم ہوں مگر ان کا قلم اتنا ہی بیباک اور غیر جانبدار ہوتا ہے۔ وہ قلم اٹھاتے ہوئے کسی پاسداری کا خیال نہیں کرتے۔ نہ ہی وہ اپنی تحریروں میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔ وہ بے دھڑک اور بے خوف ہو کر اپنے مافی الضمیر کو بیان کرتے ہیں۔ وہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں سے چشم پوشی نہیں کرتے بلکہ سود وزیاں کی پرواہ کئے بنا انہیں بے نقاب کر دیتے ہیں۔ یہ سچائیاں تلخ اور تکلیف دہ سہی مگر حقیقت بہر حال حقیقت ہوتی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں رشوت خوری کی علت وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اقربا پروری کا سماج کے ہر شعبے میں بول بالا ہے۔ حق تلفی ایک عام سی بات بن کر رہ گئی ہے۔ اس حق تلفی کا شکار ہمیشہ نچلا طبقہ ہوتا ہے جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ کتنا بڑا المیہ یہ ہے کہ قابل اور مستحق امیدوار پیچھے رہ جاتے ہیں۔ جبکہ نالائق اور غیر مستحق امیدوار اونچے اونچے عہدوں کے لئے چنے جاتے ہیں۔ اس استحصال، ناانصافی اور حق تلفی پر وانی صاحب یوں طنز کرتے ہیں:

> ''کمل کانت جب دکاندار اپنے گاہک کو ماچس کی ڈبیہ یا صابن کی ٹکیہ مفت نہیں دیتا ہے تو تجھے کیا اتنی بڑی اسسٹنٹ پروفیسری محض تیری ذہانت اور قابلیت کی بنیاد پر مل جاتی۔ تجھے پتا ہونا چاہئے دو لاکھ روپے سے یہ سودا شروع ہوا تھا اور پانچ لاکھ پہ ختم ہوا ہے۔
> اچھا یہ بتا کہ دارالعلوم کا سرپرست اعلیٰ بھی تجھے تیرا حق نہیں دلا سکا۔
> کہتے ہیں دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت ایک بادشاہ کی سی ہوتی ہے۔'' (افسانہ 'اندر کی باتیں')

وانی صاحب نے روایتی موضوعات کو ہی اپنے فکر و فن کا محور نہیں بنایا ہے بلکہ ان کی طائرانہ نگاہیں حالات حاضرہ کے سلگتے مسائل میں محو جستجو رہتی ہیں ان کے یہاں موضوع کا تنوع اور فکر کی بوقلمونی ملتی ہے۔ ذات پات اور بھید بھاؤ ایک کوڑھ کی طرح ہمارے معاشرے میں پھیلا ہوا ہے۔ مشتاق وانی ایک آزادانہ سوچ اور سیکولر ذہن رکھتے ہیں۔ وہ چھوت چھات اور اس کے منفی اثرات سے بھلی بھانتی واقف ہیں اس لئے وہ پورے شدومد

کے ساتھ اس بدعت کے خلاف کمر بستہ ہوجاتے ہیں۔

''دراصل جیون داس بچپن سے ہی آزاد خیال اور باغیانہ طبیعت کا حامل تھا۔ وہ دھرم کرم اور ذات پات میں بٹے لوگوں کو دیکھتا یا مذہب اور دھرم کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم دیکھتا تو اس کا دل اندر ہی اندر چھلنی ہوجاتا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا کہ نسل آدم اعضائے بدنی کے اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک اور ایک منہ، ایک زبان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں، دو پاؤں اور خون میں بھی کوئی فرق نہیں۔ بالکل سرخ رنگ کا تو پھر یہ ہندو مسلمان سکھ عیسائی بدھ اور جین کے علاوہ بے شمار ذاتوں اور عقیدوں میں بٹا یہ انسان کیوں؟'' (افسانہ 'باغی')

ان کی تحریریں دل کو جھنجھوڑتی ہیں۔ شعور کو مہمیز کرتی ہیں، سینے میں جوش بھرتی ہیں اور فکر کو نئی سمت اور اڑان کی طرف لے جاتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

''میرے دیش میں بسنے والے بھائیو، بہنو اور بزرگو! ہم سب انسان ہیں مگر مختلف فرقوں، ذاتوں اور رسموں رواجوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے کوئی مسلمان، کوئی سکھ، کوئی بدھ اور کوئی جین کہتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت ساری ذاتوں میں ہم بالکل سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ ان مذہبوں، دھرموں اور ذاتوں کی بنیاد پر ہم ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ قتل وغارت کا بازار گرم کرتے ہیں۔ ہم نے ان چیزوں کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے کہ ہمارا ملک ترقی کے بدلے انتہائی تنزلی کا شکار ہو کے رہ گیا ہے۔ اس لئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں امن اور خوشحالی قائم ہو ہمارا ملک ہر طرح سے ترقی کرے اور ہمیں صحیح زندگی کا لطف حاصل ہو تو اس کے لئے آپ کو میری ایک نصیحت پر عمل کرنا ہوگا وہ یہ کہ آپ تمام دھرموں، مذہبوں، ذاتوں، رسموں اور رواجوں سے اپنا دامن

حیات چھڑالیجئے۔آپ کا کوئی بھی دین دھرم نہ ہو نہ کوئی ذات ہو بلکہ
آپ صرف انسان بن کے رہیں۔کوئی بھی مذہبی پابندی نہ ہو کیونکہ
مذہبی جنون ہماری تمام آزادیاں اور عیاشیاں ختم کر دیتا ہے۔"

وہ ایک ماہر جراح کی طرح اپنے قلم کے نشتر سے سماج میں پل رہے ان پھوڑوں کو چیر ڈالتے ہیں جن میں فاسد مواد بھرا پڑا ہے۔وہ ناصح بن کر ہمیں لیکچر نہیں دیتے بلکہ جو کچھ بھی کہنا ہوتا ہے وہ اپنی کہانی کے کردار سے بڑے سلیقے سے کہلواتے ہیں۔ان کے افسانے بڑے سرل اور سلجھے ہوئے انداز میں اپنے افکار و احساسات اپنے قاری تک پہنچانے میں کامیاب رہتے ہیں۔موضوع اور کشمکش کے اعتبار سے وہ سادگی و پرکاری، ایجاز و اختصار کے ذریعے اپنے افسانوں کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتے ہیں۔

انسان کی یہ فطرت رہی ہے کہ وہ اپنی کامیابی اور ناکامی کے لئے خدا کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔اچھا ہوا تو خدا نے کیا۔برا ہوا تو الزام خدا پر ہی ڈالا جاتا ہے۔مادہ پرستی اور نفسانی خواہشات نے آدمی کو بڑا خود غرض، بے ایمان اور ریا کار بنا دیا۔آج ہر شخص کی زندگی میں الجھاؤ ہے، ٹکراؤ ہے اور وہ انہیں پیچیدگیوں کے پیچ و خم میں الجھا ہوا ہے۔وانی صاحب معاشرے کی المناکیوں کو بڑی جی داری کے ساتھ برہنہ کرنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔

> "خواتین و حضرات! آپ میں سے تقریباً بہت سے افراد کا کہنا ہے کہ سب کچھ خدا ہی کرواتا ہے، میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں دن رات جو کروڑوں ٹن شراب پی جاتی ہے، لاکھوں زنا کے اڈے قائم ہیں، اس کے علاوہ رشوت، ظلم، استحصال، چیزوں میں ملاوٹ، ہیرا پھیری، دھوکہ، فریب، حق تلفی، ڈاکہ زنی، غنڈہ گردی، شکم مادر میں بیٹیوں کا قتل، حقوق اللہ اور حقوق العباد سے چشم پوشی، غرضیکہ یہ سب کچھ کیا خدا ہی کرواتا ہے؟ میں اس اہم سوال کا جواب چاہتا ہوں؟" (افسانہ 'ایک اہم سوال')

مشتاق احمد وانی کے افسانوں کے زیادہ تر کردار متوسط طبقے کے معاشرتی ماحول

سے مستعار ہیں۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کا بڑی گہرائی سے نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں۔ جیسے ''بابا کو کچھ ہو گیا ہے'' وغیرہ۔ ان کے کچھ افسانوں کے عنوان مجھے بڑے غیر روایتی اور عجیب سے لگے۔ مثلاً 'جسم خور کیڑا'، 'آنکھوں کی عصمت دری'، 'بابا کو کچھ ہو گیا ہے' ان عنوانوں سے لگتا ہے کہ جیسے آپ ابن صفی کی کہانیاں پڑھنے جا رہے ہوں۔ وانی نے اب تک جتنے بھی افسانے لکھے وہ سارے حقیقت پسندانہ رہے ہیں۔ رومانیت سے لگتا ہے انہیں پرہیز ہے۔ اب تک مجھے ان کا کوئی بھی رومانی افسانہ پڑھنے کو نہیں ملا۔ وہ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اس لئے وہ جو کچھ لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ ان کی زبان کی سادگی اور شگفتگی قاری کے دل کو موہ لیتی ہے۔ ان کے بیانیہ میں بلا کی رعنائی اور فصاحت ہوتی ہے۔ وہ الفاظ کو موتیوں کی طرح چن لیتے ہیں اور پھر انہیں ایک لڑی میں پرونے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

''نوری مجھے وقت کے گزرنے کا احساس اندر ہی اندر نوچتا اور جھنجھوڑتا ہے۔ کبھی کبھی یہ تمنا کرنے لگتا ہوں کہ کاش وقت کی رفتار تھم جائے اور تغیر نام کی کوئی چیز دنیا میں نہ رہے۔ میں جوان رہوں اور تم بھی جوان رہو۔ ہم دونوں عشق کی ڈور میں یوں ہی بندھے رہیں کہ یہ ڈور کبھی ٹوٹنے نہ پائے۔ مگر یہ سب کچھ چاہتے ہوئے بھی ہم دونوں وقت کے آگے بے بس و مجبور ہیں کیونکہ وقت جیسے دیو ہیکل کے سامنے کوئی بھی نہیں ٹک سکا ہے۔ اس نے آج تک سب کو تہس نہس کر دیا ہے۔ یہ بڑی بے دردی سے سب کو روندتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ سچ کہتا ہوں، شادی کے موقع پر تم بہت حسین و جمیل تھیں۔ شادی کے بعد تمہارا حسن ماند پڑ گیا ہے۔ تمہاری لمبی گھنیری زلفوں میں چاندی جیسی سفیدی اگ آئی ہے۔ تم اس سفیدی کو سیاہی میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہو مگر وقت صداقت کی لاٹھی سے ہر کھرے کھوٹے کی نشاندہی کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ تمہارے موتی جیسے دانتوں میں نیلا پن در آیا ہے۔ لگتا ہے

انہیں اندر ہی اندر کوئی کیڑا برباد کرنے میں لگا ہے۔ تمہارے جسم کی
وہ تمام دلکش رعنائیاں اور وہ تمہارا انداز دلرُبائی آخر کہاں گیا؟ نوری
ہم سب ذمہ داریوں کے بوجھ تلے اس قدر دب جاتے ہیں کہ ہمیں
اپنے آپ کا بھی علم نہیں رہتا۔ وقت نے ہمیں کس مقام پر لاکھڑا کیا
ہے اور آخر کار ہمارا انجام کیا ہوگا ذرا سوچو تو سہی۔ دیکھو تم میری باتیں
سن کر مایوس ہو رہی ہو۔ اچھا چھوڑو یہ باتیں، یہ بتاؤ میں تمہیں کیسا
لگ رہا ہوں؟'' (افسانہ 'جسم خور کیڑا')

'جسم خور کیڑا' ایک جذباتی کہانی ہے جس میں ڈھلتی عمر کا احساس اور پیش آئندہ سختیوں کا تصور غلام عباس اور اس کی بیوی نوری کو خوفزدہ کرتا ہے۔ اس میں انسانی قدروں کی پامالی کا نوحہ ہے۔ بچوں کی بے رخی اور بدلتے حالات کی ستمگری کا المیہ بیان ہے۔ یہ ایک کڑوی سچائی ہے کہ آج کل کے بچے ماں باپ کے بوڑھے ہونے پر اُنہیں اپنے لئے بوجھ سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ انہیں یا تو اپنی ٹھوکروں میں رکھتے ہیں یا انہیں گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''بیٹا میرے تین بیٹے ہیں، بیٹی کوئی نہیں ہے تینوں کو بڑے ناز و نعم
سے میں نے پڑھایا لکھایا بڑا بیٹا فوج میں بریگیڈیر ہے، دوسرا
تحصیلدار ہے اور تیسرا آپ کے شہر کا سب سے بڑا بزنس مین ہے۔
بڑے بیٹے کی شادی کی تو کچھ ہی دنوں کے بعد وہ اپنی بیوی کے ہمراہ
مدراس چلا گیا۔ اس کے بعد دوسرے بیٹے کی شادی کی تو وہ بھی ہم
سے الگ ہو گیا اور تیسرے بیٹے کی شادی کی تو وہ تین سال تک
ہمارے ساتھ رہا۔ اس کے دو بچے ہونے کے بعد وہ اور اس کی بیوی
ہم سے نفرت کرنے لگے محض اس بات پر کہ مجھے رات کو کھانسی آتی
تھی اور میری کھانسی کی وجہ سے ان کی نیند میں خلل پڑتا تھا۔ چنانچہ
تین سال کے بعد وہ بھی ہم سے الگ ہو گئے۔ میری کروڑوں کی
پراپرٹی پر جب میرے بیٹے لڑنے جھگڑنے لگے تو میں نے سب

کچھ ان میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے میری ہر چیز کو سنبھال لیا لیکن ہم بوڑھوں کو انہوں نے نہیں سنبھالا۔ وہ ہمیں تقسیم نہیں کر سکے۔ بیٹے ہم تو جتنا تک ایک دوسرے کے ساتھ جائیں گے میری بوڑھی کملاوتی بڑی مشکل سے میرے اور اپنے لئے دو وقت کا کھانا تیار کرتی ہے۔ بیٹا شاید ہم دونوں بہت جلد وردھ آشرم میں داخلہ لیں گے۔ کم از کم زندگی کے کچھ دن کسی کی دیکھ بھال میں تو گزر جائیں گے۔"

(افسانہ "جسم خور کیڑا")

افسانہ 'پانچ سال کا بن باس' سب سے طویل افسانہ ہے۔ اس کا بیانیہ بڑا سپاٹ ہے۔ وانی صاحب نے ایک روایتی قصہ گو کی طرح ایک طویل قصہ بیان کیا ہے۔ زلفاں بی بی کا والد امان اللہ اپنے آبائی گاؤں کو چھوڑ کر شہر میں آ کے بستا ہے۔ وہ اپنے بچّوں کو اچھی تعلیم دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ زلفاں بی بی جو کہ سب سے بڑی بیٹی ہے، ایم ایس سی باٹنی کر رہی ہوتی ہے۔ جب اسے اپنے آبائی گاؤں میں پانچ سال کے لئے رضا کارانہ طور پر معلّمہ بن کر جانا پڑتا ہے تو شہری ماحول کی پروردہ زلفاں بی بی گاؤں جانے کے نام سے ہی کانپ جاتی ہے جبکہ اس کا باپ اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور اسے اپنے ساتھ اپنے آبائی گاؤں لے کر جاتا ہے۔ ایک پچھڑے ہوئے علاقہ میں کن کن مشکلات سے اسے جھوجنا پڑتا ہے اس کا ذکر افسانہ نگار نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ زلفاں بی بی اپنے حسن سلوک سے پورے گاؤں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ افسانہ نگار نے جس فصاحت سے اس کہانی کو بیان کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ خاص طور سے جس طرح ماحول کی منظر نگاری کی گئی ہے ایسا لگتا ہے جیسے ایک ایک منظر فلم کی ریل کی طرح ہمارے سامنے چل رہا ہے۔ افسانہ نگار نے ماحول کی جس طرح عکاسی کی ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کہانی کار کے تخیل کی دھند میں سے اس کہانی کا جنم نہیں ہوا ہے بلکہ کہانی کار نے اس ماحول کی باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے۔ کہانی کا بیانیہ بڑا سرل اور رواں ہے۔ بس ایک ہی کمی مجھے اس کہانی میں کھٹکی۔ اس کے کلائمکس کا پہلے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہانی کا کلائمکس کچھ اس طرح ہونا چاہئے تھا جو قاری کو چونکا دیتا۔ بہر حال اس کہانی میں گاؤں کی مٹی کی مہک ہے جو قاری کو شرابور کر سکتی ہے۔

مشتاق احمد وانی کا بیانیہ انداز بھی انسانی رشتوں کے اتار چڑھاؤ کو پیش کرتا، نظر آتا ہے۔ وہ انسانی استحصال کے مخالف ہیں۔ ان کی نظر مستقبل پر بہت گہری ہے۔ ان کے کردار ہمارے اطراف سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ میں وانی صاحب کو ان کے آنے والے مجموعے ''اندر کی باتیں'' کے لئے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

■❖■

دیپک بُدکی

(غازی آباد، یوپی)

09868271199

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی 'اندر کی باتیں'

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'اندر کی باتیں' منصۂ شہود پر نمودار ہو رہا ہے۔ قریب بیس برس سے وہ قارئین کو اپنے افسانوں سے محظوظ کرتے آرہے ہیں اور تا حال ان کا قلم فعال ہے۔ انھوں نے بحیثیت افسانہ نگار، نقاد اور محقق برصغیر ہند و پاک کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں میں اپنا لوہا منوایا ہے جو نہ صرف ان کے لیے بلکہ ریاست جموں و کشمیر کے لیے بھی باعث افتخار ہے۔

ڈاکٹر وانی ریاست جموں و کشمیر کے دور دراز گاؤں بھوتہ، ضلع ڈوڈہ میں ۳؍ مارچ ۱۹۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ ایم اے اور بی ایڈ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے مقالہ بعنوان 'تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران' رقم کر کے جموں یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ اس کے باوجود تشنگی برقرار رہی۔ اس لیے انھوں نے مزید موتی برآمد کرنے کے لیے بحرِ علم میں پھر سے غوطہ لگایا۔ بڑی تگ و تاز اور محنت کے بعد انھوں نے 'اردو ادب میں تانیثیت' کے عنوان سے مبسوط مقالہ لکھا اور روہیلکھنڈ یونیورسٹی بریلی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی۔ ادبی میدان میں مشتاق احمد وانی نے افسانہ نگاری سے شروعات کی اور پھر تحقیق و تنقید کی طرف بھی مائل ہو گئے۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

☆ افسانوں کے مجموعے: ۱) ہزاروں غم [افسانے، ۲۰۰۱]؛ ۲) میٹھا زہر

[افسانے، ۲۰۰۸ء]

☆ تحقیقی و تنقیدی تصانیف: ۱) تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران [۲۰۰۲ء]؛ ۲) آئینہ در آئینہ [۲۰۰۴]

(۳) اعتبار و معیار [۲۰۱۱ء]؛ ۴) اردو ادب میں تانیثیت [۲۰۱۳]؛ ۵) شعور بصیرت [۲۰۱۴ء]۔

موصوف کی نگارشات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انھیں جتنی دسترس افسانہ نگاری پر حاصل ہے اتنا ہی کمال انھیں تحقیق و انتقادیات میں بھی حاصل ہے۔ پہلی صنف کا تقاضا ہے کہ افسانہ نگار فرد اور سماج کے مختلف گوشوں کا عمیق مشاہدہ کرے جبکہ دوسری صنف کا تقاضا ہے کہ ادیب مطالعے میں غرق رہے اور ادب کے ہر گوشے پر کڑی نگاہ رکھتا ہو۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ہر دو شعبوں میں سرخ رو ہو چکے ہیں ۔جہاں تک ان کی افسانہ نگاری کا سوال ہے، 'ہزاروں غم' سے لے کر اب تک وہ ایک لمبا سفر طے کر چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فکر و نظر کا ارتقا صاف نظر آتا ہے۔ موضوعات میں بوقلمونی، کرداروں میں تنوع اور اسلوب میں اثر انگیز لب ولہجہ ملتا ہے۔ مشتاق احمد وانی نے جن دنوں ہاتھ میں قلم اٹھایا اس وقت جدیدیت کا سورج غروب ہو چکا تھا، ادیب علامتی و استعاراتی چیستاں سے فرار پانے کے متمنی تھے اور 'ترسیل کے المیے' سے چھٹکارا پانے کے لیے کہانی میں 'کہانی پن' لوٹ آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں قاری سے کھل کر براہ راست مخاطب ہوئے اور انھوں نے اظہارِ خیال کے لیے بیانیہ کو منتخب کیا۔ چنانچہ وہ ایک دور دراز پسماندہ علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے غریب اور پسماندہ لوگوں کی نمائندگی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس حد تک ان کی تحریروں میں ترقی پسندی کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھر بھی تامل نہیں ہے کہ وہ کسی مکتبِ فکر کی پیروی نہیں کرتے۔ وہ صرف اور صرف حقیقت پسندی کو اپنائے اپنی ایک انفرادی ڈگر پر گامزن ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی خدا پرست اور صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ انھیں اپنے دین سے بے حد لگاؤ ہے اور خدا کے انصاف، رحم اور فیوض و برکات پر پورا بھروسہ ہے۔ اسلامی اقدار کے وہ دلدادہ ہیں اور ان میں نجات کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔ انھیں ہم عصر زندگی کی

بے راہ روی، قدروں کی پامالی، انفرادی بددیانتی اور اجتماعی تخریب کاری سے نفرت ہے اس لیے ان کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔ بااین ہمہ ان کے افسانوں میں اکثر ان کا نظریۂ حیات حاوی ہو جاتا ہے، متن پر قلم کار غالب آجاتا ہے اور حقیقت پسندی کی جگہ مثالیت پسندی لے لیتی ہے۔ افسانہ 'اندر کی باتیں'، 'پانچ سال کا بن باس' اور 'چہرہ چھپائے لوگ' اس رجحان کی چند مثالیں ہیں۔ تینوں افسانوں میں افسانہ نگار کی معلم گری اور ناصحانہ فطرت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ نمونے کے لیے 'چہرہ چھپائے لوگ' میں راج محمد کی اپنی بیٹی کو دی گئی نصیحت ملاحظہ کیجیے۔

> ''میری بیٹی! میری نصیحت آمیز باتوں پر عمل کرنا، بیٹیاں گھروں کی زینت اور رحمت ہوتی ہیں لیکن جب ان کے قدم بہک جاتے ہیں تو ماں باپ کے لیے زحمت اور بدنامی کا باعث بنتی ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں تم علم کی شمع بنو، رونق محفل نہ بنو۔ تم کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرو لیکن تمھارے رخ پر نقاب رہے تاکہ تم پر کسی غیر محرم کی نگاہ نہ پڑنے پائے۔''

افسانوں کے مجموعے 'اندر کی باتیں' میں بارہ افسانے شامل ہیں جو ہم عصر معاشرے کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ افسانہ 'جسم خور کیڑا' کا عنوان سن رسیدگی اور طفیلیت کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جس میں تین آسودہ حال بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی دولت مند ضعیف العمر لالہ مدن گوپال اور اس کی شریمتی کو وِردھ آشرم میں پناہ لینے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ افسانے کو ایک غریب جوڑے کی عینک سے دیکھا گیا ہے جس سے نہ صرف کہانی میں تخالف پیدا ہوا ہے بلکہ ٹریٹمنٹ میں انوکھا پن در آیا ہے۔ جاں نثار جوڑے، غلام عباس اور نوری، کے کردار بڑی ہنر مندی سے منعکس کیے گئے ہیں۔ افسانہ 'اندر کی باتیں' پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانی افسانہ نگار کی نجی زندگی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر وابستہ ہے۔ افسانے میں ایک ہونہار، محنتی اور ذہین امیدوار کو اسسٹنٹ پروفیسری کے لیے اس لیے نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ وہ صدرِ شعبہ کی حرصِ زر اور ہوسِ نفس کو پورا نہیں کر پاتا۔ اس کی جگہ ایک ناقابل اور نابکار مگر زمانہ ساز امیدوار کو چن لیا

جاتا ہے۔ یہ افسانہ ہمارے موجودہ تنزل یافتہ معاشرے کو درشاتا ہے۔ افسانے کا ناامید کردار، کمل کانت اس حالت سے فرار پانے کی سوچتا ہے۔ اس کو کئی راستے سوجھتے ہیں جیسے خودکشی، دہشت گردی یا پھر ساری کتابوں کو دریا برد کر کے اپنی انٹلکچول قوت کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنا مگر اس کا دوست اسے روکتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ اس سے بہتر ہے ایشور کی شرن میں چلے جانا کیونکہ وہ بڑا کارساز ہے۔ افسانے میں بطور ڈرامائی انصاف چترنجن باسو، جو کمل کانت کے مستقبل کو برباد کرنے کا ذمے دار ہوتا ہے، آخرش کوڑھ کا شکار ہوتا ہے۔ افسانہ 'چہرہ چھپائے لوگ' میں موجودہ دور کے تعلیمی اداروں اور نئی نسل کی بے ضابطگیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیسے تعلیمی ادارے نظر بازی اور عاشقی کے اڈّے بن چکے ہیں اور اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

'بابا کو کچھ ہوگیا ہے' مختصر افسانہ ہے اور افسانچہ کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ افسانے میں ایک فرض شناس مدرس کو زندگی کی المناک حقیقتوں کا سامنا کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہ اس وقت حیران ہو جاتا ہے جب وہ ایک ایسے بابا کو دیکھتا ہے جو ایک طرف لوگوں کو رام کتھا سناتا ہے اور دوسری طرف شراب پی کر راستے پر لڑھکا ہوا مل جاتا ہے۔ ایسا ہی مختصر افسانہ 'ایک اہم سوال' ہے جو اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ بُرے کام کا بُرا نتیجہ ہوتا ہے۔ افسانے میں بے ایمان بدرالدین کی ساری پونجی اس کی غیر حاضری میں گھر سے چوری ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک اہم سوال اٹھایا ہے۔ ہمارا ایقان ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ خدا کرواتا ہے اس لیے برے کام بھی وہی کرواتا ہوگا؟ یہ سوال ہزار ہا برس سے دانشوروں کو پریشاں کرتا رہا ہے مگر آج تک کوئی معقول جواب نہیں مل سکا۔ 'فتنہ' بھی مختصر افسانہ ہے جس میں مولوی نعیم الدین کی اس وقت فضیحت ہوتی ہے جب نماز ادا کرتے وقت خود اس کی جیب میں رکھے ہوئے موبائیل پر فلمی گانا بطور کالر ٹیون بج اٹھتا ہے۔ مطلب یہ کہ بظاہر پارسا لوگ بھی اس زمانے میں زندگی کی لطافتوں سے کنارہ نہیں کر پاتے۔

'پانچ سال کا بن باس' ایک کرداری افسانہ ہے اور حاصل مجموعہ بھی۔ اس افسانے میں ایک نیک، عینیت پسند، ارادے کی پکی اور اولوالعزم تعلیم یافتہ لڑکی، زُلفاں بی

بی اپنے والد کی رہنمائی کے باعث آبائی گاؤں میں اجالا کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کرتی ہے اور ہر اس رکاوٹ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے جو اس کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔ زلفاں بی بی اس وقت غیر شعوری طور پر اپنی ایمان داری کا ثبوت دیتی ہے جب وہ غیر حاضر ہو کر حاضر لگائے جانے پر اعتراض کرتی ہے۔ آخر کار کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ زلفاں کا کردار حالانکہ خیالی اور مثالی ہے مگر قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور نئی نسل کی لڑکیوں کے لیے مشعل راہ بن سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس افسانے میں زلفاں کے والد امان اللہ کا کردار بھی بہت اہم ہے کیونکہ وہ اپنی بیٹی کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس کو انسانی ہمدردی، قربانی اور ایثار کا درس دیتا ہے۔ اسی طرح 'باغی' ایک ایسے براہمن زادے کی کہانی ہے جو سماجی بندشوں سے بغاوت کر کے ایک نیچی ذات کی لڑکی سے شادی کر کے بنیاد پرست قوتوں سے لوہا لیتا ہے۔ اس افسانے میں بھی کہیں کہیں افسانہ نگار کی ناصحانہ حس جاگ اٹھی ہے۔

'آنکھوں کی عصمت دری' میں ایک جبری وانضباطی ماحول میں پلا گیانی پنڈت یوں تو زندگی کی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے مگر معاصر نمائشی فضا کی رنگینیوں میں کھو کر اپنی جبلی ضرورتوں پر قابو پانے میں ناکام رہتا ہے اور انجام کار ذہنی صحبت کا شکار ہو جاتا ہے۔ جنسی موضوع پر لکھا گیا ایک اور خوبصورت افسانہ 'چھپا سانپ' انسانی نفسیات کے مشاہدے پر دال ہے۔ افسانہ تذویج محرمات پر رقم کیا گیا ہے جس میں ایک مذہبی مقتدا پنڈت رتن شاستری اپنی تمام تر خوبیوں اور ظاہری رکھ رکھاو کے باوجود اپنی بہو مینا کشی سے منہ کالا کرتا ہے اور اس کی خودکشی کا سبب بن جاتا ہے۔ نتیجتاً پولیس اس کو حراست میں لیتی ہے اور اس کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ افسانہ 'باہر اور اندر کا منظر' موجودہ زمانے کے شہرت یافتہ دکانداروں کی پول کھولتا ہے اور یہ بتلاتا ہے کہ آج کل نام آوری دیانت داری سے نہیں بلکہ تشہیر کاری سے ملتی ہے۔ افسانے میں ایک مشہور حلوائی سیوا ناتھ کی دُکان کا ایکس رے پیش کیا گیا ہے کہ کیسے اس کی دکان پر بننے والی مٹھائیوں میں ملاوٹ ہوتی ہے اور حفظِ صحت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا۔ افسانہ 'سرگوشی' ایک لطیف اور ہلکا پھلکا افسانہ ہے جس میں باہمی عشق و محبت میں سرشار جوڑا اعتبار کی عدم موجودگی کا مظاہرہ کرتے

ہیں اور لڑکی معمولی سی بات پر اپنے معشوق پر شک کرنے لگتی ہے۔

مجموعے میں افسانہ نگار نے کردار نگاری کی جانب خصوصی توجہ دی ہے۔ وہ کردار کی خوبیاں اور خامیاں دونوں ابھارنے کی ہر دم کوشش کرتے ہیں تاکہ کردار نکھر کر قاری کے سامنے آئے۔ مجموعے میں جہاں ایک طرف 'اندر کی باتیں' کا کمل کانت، 'بابا کو کچھ ہوگیا ہے' کا فردوس احمد اور 'پانچ سال کا بن باس' کی زُلفاں بی بی جیسے مثبت کردار ملتے ہیں وہیں 'ایک اہم سوال' کا بدرالدّین اور 'چھپا سانپ' کا پنڈت رتن شاستری جیسے منفی کردار بھی ملتے ہیں۔ عام طور پر ان کے کردار حرکی اور ارتقا پذیر ہوتے ہیں جو واقعات کے ساتھ خود کو ڈھالتے ہیں۔ مجموعے کے کئی افسانے مثلاً 'پانچ سال کا بن باس' کرداری افسانوں کے زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں کیونکہ ان میں مرکزی کردار مدار بن جاتا ہے اور واقعات اس کے اردگرد گھومتے ہیں۔ زلفاں بی بی کا کردار بہت ہی فکرمندی کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔

افسانہ نگار نے کئی افسانوں میں مختلف مناظر کی تصویر کشی بڑی ہنروری سے کی ہے جیسے 'اندر کی باتیں' میں سات ستارہ ہوٹل کا بیان، 'پانچ سال کا بن باس' میں گاؤں اور سکول کی حالتِ زار کی عکاسی یا پھر 'سرگوشی' میں پارک کا نظارہ۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں بیانیہ کے علاوہ حسب ضرورت مکالمے بھی ملتے ہیں جو کردار کی شخصیت کا آئینہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ انھیں زبان پر مکمل دسترس حاصل ہے اور وہ سلیس، رواں اور شگفتہ زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ علامتوں اور استعاروں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنی بات کھل کر کہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سے کچھ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆ ''سر! انسان کو نیک نیتی سے نیک کام کرنا چاہیے، میں دیس اور بھیس میں بدلاؤ چاہتی ہوں، لہٰذا ہمیں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ ہم اپنی استعداد کے مطابق کوشش کریں گے۔ (پانچ سال کا بن باس)

☆ ''شاعری نہیں کررہی ہوں، سچ کہتی ہوں۔ وقت اور مسائلِ حیات انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ گردشِ روز وشب نے ہم سے ہمارا بچپن اور لڑکپن چھین لیا ہے۔ میری سہیلیو! جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔'' (پانچ سال کا بن باس)

☆ وہ چاہتا تھا کہ تمام لوگ مذہبوں، دھرموں، ذات پات، چھوت چھات اور ریتی رواج کو چھوڑ کر انسانیت کے رنگ میں رنگ جائیں کیونکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دنیا میں انسان کا خون سب سے زیادہ مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر بہایا گیا ہے۔(باغی)

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایسے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں زندگی کی بنیادی سہولیات میسر نہیں۔ بچپن کی ان یادوں کی خلش ان کے سینے میں آج بھی چھپی نظر آتی ہیں۔ ایسے پس منظر میں ان کی زندگی مسلسل کشمکش کی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے عزم واستقلال کے ساتھ تعلیم کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں جس کے لیے انھیں کافی مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ ان کے افسانوں میں ذاتی تجربات اور وسیع مطالعہ شیرۂ انگور کی مانند ٹپکتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ایسے تہذیب یافتہ سماج کا تصور کرتے ہیں جس میں انسانیت ہو، ہمدردی ہو اور خوشحالی ہو۔ ان کا یہ رویہ ان کے قلم کی طاقت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی آئندہ بھی اردو ادب کی آبیاری کرتے رہے ہیں گے اور خوب سے خوب تر افسانے قارئین کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔

■❖■

معین الدین عثمانی

(جلگاؤں، مہاراشٹر)

09921299749

'اندر کی باتیں' بیانیہ کا واضح اشاریہ (تعارفی مطالعہ)

اردو ادب میں افسانہ مغربی دروازے سے داخل ضرور ہوا مگر اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں یہیں کی مٹی میں اپنی جڑیں پیوست کر دیں اور اب داستان گوئی، قصہ خوانی سے لے کر رومانیت، ترقی پسندی اور جدیدیت، مابعد جدیدیت کا دور دیکھنے کے بعد پھر اپنی ابتدائی کوشش کو اپناتے ہوئے ماجرائی کیفیت کے ساتھ بیانیہ کی طرف مراجعت کی ہے۔ افسانے کے اس سفر میں کئی چھوٹے بڑے قافلہ سالاروں نے قدم سے قدم ملا کر اس کارواں کو آگے بڑھایا۔ مجھے خوشی ہے کہ افسانہ نگاروں کے قافلوں کی اس بھیڑ میں مشتاق احمد وانی نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ ممکنہ نقوش چھوڑے ہیں۔ جو ادب کی دنیا میں انہیں آباد رکھیں گے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی مسائل سے عبارت ہے۔ آفرینش سے لے کر موت تک انسان مختلف مسائل سے جھوجھتا ہے۔ بعض مسائل سے نبرد آزمائی میں اسے کامیابی ملتی ہے تو بعض میں ناکامی۔ اس کامیابی و ناکامی کو جھوجھنے میں انسان کو مختلف تجربات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عام طور پر یہی ہمارے اردو افسانے کے موضوعات ہیں۔ یہ تجربات ذاتی نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں یا پھر مطالعے و مشاہدے کی دین بھی۔ ذاتی نوعیت کا کوئی تجربہ جب کوئی فنکار بیان کرتا ہے تو اس کی تاثیر میں رشوت در آتی ہے اور تحریر کا رنگ و روپ نکھر جاتا ہے۔ جن لوگوں کے پاس قوت احساس کے اظہار کی صلاحیت

زیادہ ہے وہ اپنے عمیق مطالعے اور مشاہدے کی بنیاد پر اوروں کے تجربات اس انداز سے بیان کرجاتے ہیں کہ جگ بیتی پر آپ بیتی کا گمان ہونے لگتا ہے کیونکہ اس میں صاحب تحریر کا کرب شامل ہوجاتا ہے۔

انسانی زندگی میں روزگار کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی حصولیابی کے لئے لوگ نت نئے تجربات بروئے کار لاتے ہیں۔ غلط طریقے سے حاصل کردہ چیز کا انجام غلط ہوتا ہے کہ یہ فطرت کا اصول ہے۔ مستحق ہونے کے بعد مقصد کی عدم دستیابی پر جو ذہنی اذیت ہوتی ہے اس کا اندازہ تو وہی کرسکتا ہے جس پر اس طرح کا کوئی سانحہ گزرا ہو۔ اس طرح کے عمومی مسائل اور موضوعات سے اردو فکشن کا دامن بھرا پڑا ہے اس کے باوجود بھی ہمارے موجودہ فنکاروں کی تحریروں کا اس خزانے میں اضافہ روز افزوں ہے۔

'اندر کی باتیں' عنوان کے تحت جناب مشتاق احمد وانی کا افسانہ پیش نظر ہے۔ افسانہ کی نوعیت جداگانہ اس لئے نہیں ہے کہ موضوع تو اس کا بھی روزگار سے متعلق ہے مگر کہانی کو جو ٹریٹمنٹ انہوں نے دی ہے وہ ان کی تحریر کو سب سے الگ اور منفرد کردینے کے لئے کافی ہے۔ مشتاق احمد وانی موجودہ عہد کے معتبر فنکار ہیں ان کی تحریریں ملک و بیرون ملک کے معتبر رسائل میں شائع ہوا کرتی ہیں۔ اگرچہ کہ ان کا انداز نہایت سادہ ہے مگر کہانی بننے کے ہنر سے ان کی واقفیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ کہانی کے فنی لوازمات کو نہ صرف یہ کہ سمجھتے ہیں بلکہ انہیں برتنے میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی کا تعلق ایسی سرزمین سے ہے جسے ماضی میں جنت نشاں کہا گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہاں چین کی دیوی کا راج تھا۔ آج مختلف وجوہات کے سبب حالات بدلے ہوئے ہیں اور ایسے ناگفتہ بہ حالات میں بھی لوگ زندگی جینے کی جدوجہد میں مصروف ہیں تو مشتاق احمد وانی اپنی مٹی کا قرض ان تحریروں کے ذریعہ اتار کر امن وآشتی کا پیغام دے رہے ہیں۔ جس کی تعریف نہ کرنا ناانصافی کے مترادف ہوگا۔

مذکورہ کہانی کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ کہانی میں درج واقعہ کی اذیت کو انہوں نے خود جھیلا ہے۔ یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہی جاسکتی ہے مگر تحریر میں در آئی بے چینی اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے۔ دراصل فنکار کی زندگی اسے ہر لمحہ بے

چین رکھتی ہے اور یہ بے چینی جب لفظوں کے ذریعہ ہمارے سامنے آتی ہے تو گرفت میں لے کر ہی دم لیتی ہے۔

متذکرہ کہانی کا لب لباب یہ ہے کہ مرکزی کردار کمل کانت، ایک تعلیم یافتہ بے روزگار شخص ہے جو اپنے قریبی دوست نریش رانا جو پیشے سے ہوٹل مالک ہے کو اپنے ساتھ ہوئی ناانصافی کی روداد الم بیان کرتا ہے۔ نریش رانا جو اس ناانصافی میں اتفاقی طور پر چترنجن باسو کے ساتھ شریک تھا کمل کانت کو اصل حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مشتاق احمد وانی نے اندر کی باتیں میں باہر کی باتیں دہرائی ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی کہانی اس لحاظ سے کامیاب ہے کہ اس میں کہانی کے پورے لوازمات موجود ہیں۔ منظر نگاری، کردار، مکالمات اور مختصر تحیر کی آمیزش نے کہانی کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

■❖■

ڈاکٹر پرویز شہریار (نئی دہلی)
09910782964

مشتاق احمد وانی کے افسانے تہذیبی بحران پر تازیانے

مشتاق احمد وانی گذشتہ دو دہائیوں سے افسانہ نگاری کے میدان میں کافی فعال رہے ہیں۔اس دوران ان کے دو افسانوی مجموعے پہلا ۲۰۰۱ میں ''ہزاروں غم'' کے نام سے اور دوسرا ۲۰۰۸ میں ''میٹھا زہر'' کے نام سے منظرِ عام پر آنے کے بعد خاصی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔مشتاق احمد وانی نہ صرف یہ کہ اردو ادب میں اپنی ایک پہچان بنانے میں مصروف بہ عمل ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مشتاق احمد وانی کشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں میں اپنا منفرد مقام سرعت سے بنا رہے ہیں تو میرا خیال ہے کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔اب تک وہ نصف درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف اور تالیف کر چکے ہیں۔تخلیقی ادب کے علاوہ تحقیق اور تنقید کے اقلیم میں بھی قابلِ ذکر اضافہ کر چکے ہیں۔ بلکہ اب تو خود اُن پر بھی دانش گاہوں میں تحقیقی مقالات لکھے جا رہے ہیں۔

مشتاق احمد وانی نے اپنے دو افسانوی مجموعوں کے بعد سے اب تک یکے بعد دیگرے کئی افسانے سپردِ قلم کیے ہیں اور اب ان کے تازہ افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''اندر کی باتیں'' کے عنوان سے دستیاب ہو رہا ہے۔اس میں کل بارہ افسانے شامل ہیں:

(۱) اندر کی باتیں
(۲) پانچ سال کا بن باس
(۳) آنکھوں کی عصمت دری
(۴) سرگوشی

(۵) بابا کو کچھ ہو گیا ہے!
(۶) ایک اہم سوال
(۷) جسم خور کیڑا
(۸) فتنہ
(۹) باغی
(۱۰) چھپا سانپ
(۱۱) باہر اور اندر کا منظر
(۱۲) چہرہ چھپائے لوگ۔

مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں عام طور سے تہذیبی بحران پر تازیانے اور اخلاقی انحطاط کے خلاف صدائے احتجاج دیکھنے کو ملتے ہیں۔آج بھی اردو میں ایسے کئی افسانہ نگار موجود ہیں جو ادب سے اصلاحِ معاشرہ کا کام لینا جانتے ہیں۔سماجی تفاعل سے پیدا ہونے والی کسی بھی چیز کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ادب کا بھی ایک مقصد ہے۔لہٰذا، فن پاروں کو بھی مشتاق احمد وانی اصلاحِ معاشرہ کا آلۂ کار سمجھتے ہیں اور اس کے ذریعے ماحول میں پنپنے والے ضرر رساں جراثیموں کے انسداد کے لیے اپنی نوکِ قلم سے نشتر کا کام لیتے ہیں۔

اس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ افسانہ ''اندر کی باتیں'' میں مشتاق احمد وانی نے یونیورسٹیوں میں کسی وبا کی طرح تیزی سے پھیلنے والی بیماری یعنی Corruption اور Grafting کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اور اسے جڑ سے ختم کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا ہے۔حالانکہ ہمارے ملک میں ذہین اور ایماندار پروفیسروں کی کمی نہیں۔لیکن اس کے باوجود رشوت خوری اور بدعنوانی ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح اندر سے کھوکھلا کرتی جا رہی ہیں۔ ہمارے درالعلوم بھی ہمارے سماج کا ہی ایک انتہائی فعال ادارہ ہوتا ہے لیکن بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ جن تعلیمی اداروں کو بددیانتی کے جرائم سے پاک ہونا چاہیے تھا آج وہ ادارے ہر نوع کے کرپشن کے اڈے بن چکے ہیں۔اساتذہ جو کبھی اصلاحِ معاشرہ کی تربیت دیا کرتے تھے۔آج ان دانش گاہوں میں لاکھوں روپے کے لین دین سے ریسرچ اسکالروں کے مستقبل سے کھلواڑ کیا جا رہا ہے۔ماہرین اور ایکسپرٹ

کے نام پر بدعنوانیوں میں ملوث لوگ انٹرویو بورڈ میں جمع ہوتے ہیں اور نااہل امیدواروں کو رشوت کھا کر منتخب کرلیا کرتے ہیں۔ یہ کرپشن کا ایسا غیر مختتم دائرہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایک نا اہل پروفیسر اپنی ملازمت کے دوران سینکڑوں نا اہل افراد کو دانش گاہوں میں درس وتدریس جیسے مقدس پیشے کو تباہ کرنے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ مشتاق احمد وانی نے اس افسانے میں جگ بیتی بیان کی ہے۔ لیکن اس حمام میں سبھی ننگے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ براہ راست یا بالواسطہ طریقے سے ہم سبھی اس بدعنوانی کا شکار ہوسکتے ہیں۔ اگر اس نوع کے کرپشن کا بروقت انسداد نہیں کیا گیا تو یہ وبا ہماری دہلیز تک چلی آئے گی۔ رشوت خوری کی آگ سے پھر کوئی بھی اپنا دامن نہیں بچا پائے گا۔

یونیورسٹیوں میں پھیلنے والی گرافٹنگ کی وبا پر اتنی بیباکی سے اب تک کسی نے نہیں لکھا ہے۔ میں مشتاق احمد وانی کو ان کی اس فنکارانہ جرأت پر دل کھول کے داد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ گنا ہگاروں پر یہ افسانہ پہلا پتھر ثابت ہوگا اور وہ دن دور نہیں جب انھیں سرعام سنگ سار کیا جائے گا۔ ادب کا ایک منصب یہ بھی ہے کہ فن پاروں کے ذریعے گرد وپیش کی آلودگیوں کو دور کیا جائے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مشتاق احمد وانی کا افسانہ ''اندر کی باتیں'' کرپشن کا پردہ فاش کرنے میں صدفی صد کامیاب نظر آتا ہے۔ اس افسانے کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ اس کے سبھی کردار اپنی حرکات وسکنات سے گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ مختلف سیاق وسباق کے حوالے سے ان کے عمل اور رد عمل بہت فطری انداز کے دیکھائے گئے ہیں۔

''پانچ سال کا بن باس'' اس مجموعے میں شامل سب سے طویل کہانی ہے۔ مشتاق احمد وانی نے اپنے تخیل کی پرواز سے اردو افسانے کو ایک نا قابل فراموش کردار سے روشناس کرایا ہے جس کا نام کبھی بھلایا نہیں جاسکتا ہے اور وہ کردار ہے ''زلفاں بی بی''۔

زلفاں بی بی ایک ہونہار لڑکی ہے۔ گرچہ اسے قدم قدم پر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شہر سے گاؤں جانا پڑتا ہے۔ گاؤں میں بجلی، پانی، سڑک اور ان پڑھ لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خوبصورت اور جوان ہونے کی وجہ سے بدمعاشوں اور اوباشوں سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے وہ بہت ہی ہوشیاری

اور صبر وسکون سے کام لیتی ہے۔ کئی مواقع ایسے آتے ہیں کہ جہاں دوسرا کوئی شخص ہوتا تو چھوٹی موٹی بے ایمانیاں کر لیتا لیکن زلفاں بی بی بہت خدا ترس اور باہمت لڑکی تھی۔ اس کے قدم کہیں ذرا بھی نہیں ڈگمگاتے ہیں۔ وہ ہر دم اپنے ماں باپ کے بتائے ہوئے اصولوں پر سختی سے کار بند رہتی ہے اور کامیابی لگاتار اس کے قدم چومتی چلی جاتی ہے۔

گاؤں کے اسکول کی ترقی کے معاملے میں کوئی بھی دقیقہ اس سے فروگذاشت نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنی محنت اور لگن سے گاؤں کے سرپنچ، پنچوں اور نمبرداروں کے ذریعے پرائمری اسکول کو ترقی دلا کر مڈل اسکول میں بدل دیتی ہے۔

مشتاق احمد وانی نے زلفاں بی بی کے کردار کے ارتقا میں نامیاتی بالیدگی کو بہت اچھے سے ٹریٹ کیا ہے اور اس کی ذہنی پختگی اور بالیدگی کو بہت ہی غیر محسوس طریقے سے دیکھایا ہے کہ وہ اپنے والد امان اللہ کے مشورے پر کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کا امتحان دیتی ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ زلفاں کے کردار میں اس طرح کی بتدریج تبدیلی مشتاق کی فنکارانہ چابکدستی کی غماز ہے۔ زلفاں کی کامیابی پر جیت رام نمبردار جو ایک نمبر کا بدمعاش تھا وہ بھی ڈر کے مارے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اُس کے یہ جملے دیکھئے بی جس سے مشتاق وانی مکالمہ نگاری میں کتنا مشاق ہیں، وہ بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

> ''میڈم بھگوان کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔ آپ تو دیوی کا روپ ہیں۔ میں مورکھ آپ کو پہلے پہچان نہیں پایا تھا۔ جیت رام نمبرداری کی آنکھیں احساسِ ندامت سے اشکبار تھیں۔''

افسانہ ''آنکھوں کی عصمت دری'' کے آئینے میں مشتاق احمد وانی پریم چند جیسے آدرش وادی فنکار معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اخلاقی تعلیم کو اپنے اس افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ میگھ ناتھ کے معصوم ذہن پر ایک چھوٹی سی شرارت کی انتہائی سخت سزا نے انجام کار اسے ایک ایسا انسان بنا دیا کہ جسے لفظ ''پریم'' اور جنسِ مخالف کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھنا بھی گناہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بچپن کا اس زدوکوب نے میگھ ناتھ کی شخصیت پر اتنا گہرا اثر مرتب کیا تھا کہ شادی کے بعد چار بچوں کے باپ بن جانے کے بعد بھی وہ کسی عورت کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھنے کا قائل نہ تھا۔ جبکہ اُس کی عمر اکاون سال کی ہو چکی تھی۔ کہا جاتا

ہے کہ انسان اپنے ماحول سے بھی اثرات قبول کرتا ہے۔ میگھ ناتھ کے گھر میں بھی نیم عریاں اور فحش پروگرام ٹیلی ویژن پر دیکھے جاتے تھے اور دفتر میں چاروں طرف اخبار اور موبائل فون کے علاوہ لیپ ٹاپ پر عریاں عورتوں کی فحش تصاویر دیکھی جاتی تھیں۔ میگھ ناتھ گاندھی میموریل پارک اور قومی وراثت ہاؤس کی سیر کو جاتا ہے، تو وہاں کے ماحول میں بھی کھلم کھلا جنسی آمیزش کے نظارے اس کا استقبال کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر وہ دل برداشتہ ہو اٹھتا ہے۔ لیکن سنیما ہال کے پردے پر عریانیت بھری جنسی اختلاط کے مناظر دیکھ کے وہ اپنی اخلاقی قدروں کو پامال ہونے سے بالکل بھی بچا نہیں پاتا ہے اور اُسے محسوس ہوتا ہے کہ آج اُس نے اپنا سب سے قیمتی خزانہ کوڑی کے مول لُٹا دیا ہے۔

بچپن کی تادیب اور تہذیب انسان کو زندگی بھر کجروی (Perversion) سے بچاتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ آدرش اور اعلیٰ اخلاق کا یہ آبگینہ ہلکی سی جنبش سے ٹوٹ کر پاش پاش ہو جاتا ہے تو ایسے انسان کا ضمیر اُسے کبھی معاف نہیں کر سکتا ہے۔ مشتاق احمد وانی نے کمال درجہ سادگی اور فنکاری سے ایسے قولِ زریں کو ترسیل کی مزاحمت کے بغیر براہ راست ہم تک منتقل کر دیا ہے۔

''جسم خور کیڑا'' میں مشتاق احمد وانی نے فلسفۂ حیات کو افسانے کے توسط سے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ دو متوازی کہانیاں ہیں۔ ایک لالہ مدن گوپال اور کملاوتی کی جو گذر چکی ہے اور تنبیہہ الغافلین کا نمونہ ہے اُن کے لیے جو دیدہ بینا رکھتے ہیں۔ دوسری کہانی غلام عباس اور نوری کی ہے جو زندگی کے وسطی پڑاؤ میں ارمانوں اور خواہشوں کا گھروندا سجائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ مدن گوپال کی تینوں نرینہ اولاد دغا دے جاتی ہے اور وہ بے یار و مددگار دشتِ حیات میں اپنی آخری منزل کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ دوسری طرف نوری اپنے چاروں نرینہ اولاد سے بڑی بڑی آس اور امیدیں لگائے سپنوں میں جی رہی ہے۔

لیکن غلام عباس کو وہیل چیئر سے اپنی قبر کی تاریکی محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ اپنی بیوی نوری کو افسانے کے اختتام میں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ ''جسم خور کیڑا'' کیا امیر کیا غریب کسی کو بھی نہیں بخشتا۔ جب جسم کمزور پڑتا ہے انسان بوڑھا ہو جاتا

ہے تو اس کے عزیز و اقارب بھی اُس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایسے بے سہارا بوڑھے انسان کا انجام بڑا دردناک ہوتا ہے۔

یہاں مشتاق احمد وانی کی شخصیت میں مضمر تصوف کا رنگ ان کے افسانے سے جھلکتا ہے، اپنے اس پیغام کی ترسیل میں وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایسے اچھے پیغام کے لیے میں اُنھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

''فتنہ'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں باجماعت نماز پڑھاتے وقت پیش امام مولوی نعیم الدین کے موبائل فون پر گھٹیا فلمی گانے کے بول بج اُٹھتے ہیں اور اس سے مقتدیوں کی نماز میں خلل پڑ جاتا ہے اور اس سے مسجد کے اندر ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ مقتدیوں کے دو گروپ بن جاتے ہیں جو آپس میں مارنے مرنے پر اُتر آتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی نے اپنے اس مختصر افسانے میں یہ بتایا ہے کہ اکثر ہمارے مذہبی رہنما مقتدیوں کے لیے کچھ اور اپنے لیے کچھ اور معیار قائم کر لیتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ جس مسجد کے دروازے پر لکھا ہوتا ہے کہ ''مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنا موبائل فون بند کر دیجیے۔'' اسی مسجد کے پیش امام صاحب سے یہ بھاری غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا موبائل فون آف کرنا بھول جاتے ہیں اور تین برسوں کی محنت سے بنی بنائی عزت پر آن کے آن میں پانی پھر جاتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ مشتاق وانی کے اندر ایک حساس فنکار موجود ہے۔ ایسا معمولی واقعہ جسے ہم آئے دن دیکھتے اور درگذر کرتے رہتے ہیں لیکن مشتاق نے اس کی گرفت کی ہے اور اس سے اُٹھنے والے فتنے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس معنی میں یہ افسانہ بہت کارگر معلوم ہوتا ہے۔

''باغی'' میں مشتاق احمد وانی نے بین مذہبی شادی اور رسم و رواج کی حمایت میں اپنی بات رکھی ہے۔ اُن کے نزدیک سب سے بڑی چیز انسانیت ہے اور انسان کا کوئی بھی کام ایسا نہیں ہونا چاہیے جو انسان کی ترقی میں مانع ثابت ہو۔ اس افسانے میں کسی پنڈت کا بیٹا جیون اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد زندگی کو سائنسی نظریے سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور اِس وجہ سے اُسے کومل جیسی درج فہرست ذات کی لڑکی سے شادی کرنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ سماج کو توڑنے میں سیاستدانوں کا

ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنے مفاد کی حصولیابی کے لیے ہندو مسلم سیکھ اور عیسائی میں جھگڑا کراتے رہتے ہیں۔ لہٰذا، وہ ساون کی اکیسویں تاریخ کو ُملن میلہ، میں اپنے اس باغیانہ خیالات سے عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جواب میں اسے کسی احتجاج کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مشتاق اس افسانے کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی سچا مذہب یا رسم و رواج ارتقائے آدم کی راہ میں آڑے نہیں آتا۔ بلکہ سچا مذہب تو انسان کو انسان سے محبت کرنا سیکھاتا ہے۔ یہی فطری ر.یہ ہے اور یہی سائنسی نظریہ بھی ہونا چاہیے۔

''چھپا سانپ'' مشتاق احمد وانی کا زبردست افسانہ ہے جس میں انھوں نے ایک شہوت پرست پنڈت رتن شاستری کے سنگین جرم کا پردہ فاش کیا ہے جو جنسی ہوس کی آگ میں تپ کر اتنا اندھا ہو چکا تھا کہ اپنے ہی بیٹے کی بیوی میناکشی کے ساتھ زنا بالجبر کر بیٹھتا ہے اور جب بہو لوک لاج کے ڈر سے سسر اور بہو کے پاک رشتوں کو تار تار کر دینے والے سنگین جرم پر پردہ ڈال دیتی ہے تو ویدوں کا گیان رکھنے والے پنڈت کے اندر کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا سانپ نما شیطان کھل کھیلنے کی ٹھان لیتا ہے۔ لیکن ایک مشہور کہاوت ہے کہ ُوناش کالین وِپرت بُدھی، یعنی جب کسی کی تباہی لکھی ہو تو اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ پنڈت رتن شاستری بھی اپنی مصیبت کو دعوت دے کر ایک بار پھر اپنی بہو کے ساتھ منہ کالا کر بیٹھتا ہے۔ پنڈت کی بہو میناکشی بہت سوجھ بوجھ والی سمجھدار اور پاک باز عورت تھی۔ اُس کی عمر مرنے کی نہیں تھی۔ وہ اپنی تین سالہ بچی کی پرورش و پرداخت بڑے لاڈ پیار سے کر رہی تھی۔ لیکن اس کے سسر کی خباثت نے اپنی اوچھی حرکتوں سے ثابت کر دیا تھا کہ ایک عورت کی زندگی کانچ کے اُس گلدان کی طرح ہوتی ہے جو بلندیوں سے گرتے ہی پاش پاش ہو کر ایسی کرچیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ جسے سمیٹ کر دوبارہ کھڑا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، میناکشی مہا پنڈت کے آڈمبر میں چھپے شیطانی سانپ کو سب کے سامنے ننگا کرنے کی ٹھان لیتی ہے اور خود سولی پر چڑھ جاتی ہے۔ خودکشی کے بعد میناکشی کے پاس سے جو خط نکلتا ہے وہ پنڈت رتن شاستری کے کالے کرتوتوں کا راز افشاں کرنے کے لیے کافی ثابت ہوتا ہے۔ اس افسانے میں مشتاق نے کمالِ چابکدستی سے فن کو مجروح ہونے سے بچا لیا ہے اور ایسے زبردست موضوع کو افسانے کے سانچے میں ڈھالنے

ہے تو اس کے عزیز و اقارب بھی اُس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایسے بے سہارا بوڑھے انسان کا انجام بڑا دردناک ہوتا ہے۔

یہاں مشتاق احمد وانی کی شخصیت میں مضمر تصوف کا رنگ ان کے افسانے سے جھلکتا ہے، اپنے اس پیغام کی ترسیل میں وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ایسے اچھے پیغام کے لیے میں اُنھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

''فتنہ'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں باجماعت نماز پڑھاتے وقت پیش امام مولوی نعیم الدین کے موبائل فون پر گھٹیا فلمی گانے کے بول بج اُٹھتے ہیں اور اس سے مقتدیوں کی نماز میں خلل پڑ جاتا ہے اور اس سے مسجد کے اندر ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ مقتدیوں کے دو گروپ بن جاتے ہیں جو آپس میں مارنے مرنے پر اُتر آتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی نے اپنے اس مختصر افسانے میں یہ بتایا ہے کہ اکثر ہمارے مذہبی رہنما مقتدیوں کے لیے کچھ اور اپنے لیے کچھ اور معیار قائم کر لیتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ جس مسجد کے دروازے پر لکھا ہوتا ہے کہ ''مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنا موبائل فون بند کر دیجیے۔'' اسی مسجد کے پیش امام صاحب سے یہ بھاری غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا موبائل فون آف کرنا بھول جاتے ہیں اور تین برسوں کی محنت سے بنی بنائی عزت پر آن کے آن میں پانی پھر جاتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ مشتاق وانی کے اندر ایک حساس فنکار موجود ہے۔ ایسا معمولی واقعہ جسے ہم آئے دن دیکھتے اور درگزر کرتے رہتے ہیں لیکن مشتاق نے اس کی گرفت کی ہے اور اس سے اُٹھنے والے فتنے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس معنی میں یہ افسانہ بہت کارگر معلوم ہوتا ہے۔

''باغی'' میں مشتاق احمد وانی نے بین مذہبی شادی اور رسم و رواج کی حمایت میں اپنی بات رکھی ہے۔ اُن کے نزدیک سب سے بڑی چیز انسانیت ہے اور انسان کا کوئی بھی کام ایسا نہیں ہونا چاہیے جو انسان کی ترقی میں مانع ثابت ہو۔ اس افسانے میں کسی پنڈت کا بیٹا جیون اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد زندگی کو سائنسی نظریے سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور اِس وجہ سے اُسے کومل جیسی درج فہرست ذات کی لڑکی سے شادی کرنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ سماج کو توڑنے میں سیاستدانوں کا

ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنے مفاد کی حصولیابی کے لیے ہندو مسلم سیکھ اور عیسائی میں جھگڑا کراتے رہتے ہیں۔ لہٰذا، وہ ساون کی اکیسویں تاریخ کو' ملن میلہ' میں اپنے اس باغیانہ خیالات سے عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جواب میں اسے کسی احتجاج کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مشتاق اس افسانے کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی سچا مذہب یا رسم و رواج ارتقائے آدم کی راہ میں آڑے نہیں آتا۔ بلکہ سچا مذہب تو انسان کو انسان سے محبت کرنا سیکھاتا ہے۔ یہی فطری رویہ ہے اور یہی سائنسی نظریہ بھی ہونا چاہیے۔

''چھپا سانپ'' مشتاق احمد وانی کا زبردست افسانہ ہے جس میں انھوں نے ایک شہوت پرست پنڈت رتن شاستری کے سنگین جرم کا پردہ فاش کیا ہے جو جنسی ہوس کی آگ میں تپ کر اتنا اندھا ہو چکا تھا کہ اپنے ہی بیٹے کی بیوی میناکشی کے ساتھ زنا بالجبر کر بیٹھتا ہے اور جب بہو لوک لاج کے ڈر سے سسر اور بہو کے پاک رشتوں کو تار تار کر دینے والے سنگین جرم پر پردہ ڈال دیتی ہے تو ویدوں کا گیان رکھنے والے پنڈت کے اندر کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا سانپ نما شیطان کھل کھیلنے کی ٹھان لیتا ہے۔ لیکن ایک مشہور کہاوت ہے کہ 'وناش کالین وِپرت بُدھی' یعنی جب کسی کی تباہی لکھی ہو تو اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ پنڈت رتن شاستری بھی اپنی مصیبت کو دعوت دے کر ایک بار پھر اپنی بہو کے ساتھ منھ کالا کر بیٹھتا ہے۔ پنڈت کی بہو میناکشی بہت سوجھ بوجھ والی سمجھدار اور پاک باز عورت تھی۔ اُس کی عمر مرنے کی نہیں تھی۔ وہ اپنی تین سالہ بچی کی پرورش و پرداخت بڑے لاڈ پیار سے کر رہی تھی۔ لیکن اس کے سسر کی خباثت نے اپنی اوچھی حرکتوں سے ثابت کر دیا تھا کہ ایک عورت کی زندگی کانچ کے اُس گلدان کی طرح ہوتی ہے جو بلندیوں سے گرتے ہی پاش پاش ہو کر ایسی کرچیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ جسے سمیٹ کر دوبارہ کھڑا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، میناکشی مہا پنڈت کے آڈمبر میں چھپے شیطانی سانپ کو سب کے سامنے ننگا کرنے کی ٹھان لیتی ہے اور خود سولی پر چڑھ جاتی ہے۔ خودکشی کے بعد میناکشی کے پاس سے جو خط نکلتا ہے وہ پنڈت رتن شاستری کے کالے کرتوتوں کا راز افشاں کرنے کے لیے کافی ثابت ہوتا ہے۔ اس افسانے میں مشتاق نے کمالِ چابکدستی سے فن کو مجروح ہونے سے بچا لیا ہے اور ایسے زبردست موضوع کو افسانے کے سانچے میں ڈھالنے

میں وہ بڑے کامیاب رہے ہیں۔ بیانیہ بہت ہی واضح ہے۔ صاف اور شفاف نثر میں قصے کو بتدریج نقطۂ عروج تک بڑی فنکارانہ دیانتداری کے ساتھ پہنچایا ہے۔ اس طرح، انھوں نے اردو ادب کو ایک کریہہ شیطانی کردار سے روبرو کرایا ہے۔

مشتاق وانی کا 'سوچھ ابھیان' پر طنز کرتا ہوا ایک افسانہ ہے، ''باہر اور اندر کا منظر'' جس میں انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اکثر باہر اور اندر کا منظر ایک جیسا نہیں ہوتا ہے۔ سیوا ناتھ جیسے مشہور و معروف مٹھائی والے جس کی دکان کا نام ہے۔ ''دین دھرم سویٹ شاپ'' اور جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اصلی گھی میں اپنی مٹھائیاں تیار کرواتا ہے۔ لیکن ایک دن غلطی سے اس کی دکان کا اندرونی دروازہ کھلا رہ جاتا ہے اور دو گاہک احسان الحق اور اس کا عزیز دوست رادھے شیام دونوں کی آنکھوں کے آگے اُس دکان کی سچائی عیاں ہو جاتی ہے۔ سیوا ناتھ اپنی شہرت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتا تھا اور وہ بہت ہی گھٹیا روغن سے مٹھائیاں تیار کرواتا تھا۔ اس سے بھی گری ہوئی بات یہ تھی کہ اس کے یہاں صفائی کا بالکل بھی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ دونوں گاہک یہ منظر دیکھ کر دل برداشتہ ہو کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ مشتاق احمد وانی نے اپنے افسانہ ''باہر اور اندر کا منظر'' میں بڑے ہی فنکارانہ ڈھنگ سے 'اونچی دکان پھیکا پکوان' والا محاورہ سچ کر دکھایا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا کرپشن ہی ہے جس کے خلاف آواز بلند کرنا کسی بھی قلم کار کی سماجی ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری مشتاق احمد وانی نے اس افسانے کے حوالے سے بڑی ایمانداری سے نبھائی ہے۔

اسی طرح ان کا ایک افسانہ ہے، ''چہرہ چھپائے لوگ'' جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گھر سے قدم نکالتے ہی گھر کی اخلاقی تعلیم اور آدابِ معاشرت کو طاق پر رکھ کر اخلاق سوز اور بے غیرتی کے ماحول میں رنگ جاتے ہیں۔ اس افسانے میں چند بالغ اور جوان لڑکیاں اپنے گھر سے کالج جانے کے بہانے سڑک چھاپ عاشقوں کے ساتھ شہر کی آبادی سے دور گھنے جنگل کے اندھیرے میں روپوش ہو کر جنسِ مخالف کی قربتوں کا فائدہ اُٹھاتی ہیں۔ اس کام کا انھیں چسکا لگ جاتا ہے۔ لیکن انھیں سماج کا ڈر بھی ستاتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ راستے میں موٹر سائیکلوں پر سے گذرتے ہوئے وہ لڑکیاں چہرہ چھپائے پھرتی ہیں تاکہ ان کے بزرگ اور

اقارب دیکھ کر انھیں پہچان نہ لیں، اور ان کے ڈھول کا پول نہ کھل جائے۔ ایسی پینی نظر مشتاق وانی ہی کی ہوسکتی ہے۔ یہ بظاہر معمولی سا نظر آنے والا واقعہ دراصل پورے معاشرے کو بے حیائی اور جنسی بے راہ روی کی دلدل میں دھکیل رہا ہے۔ وقت رہتے اس کی سرزنش اور تدارک کی طرف مشتاق احمد وانی نے بڑی عقلمندی سے اشارہ کیا ہے۔

''سرگوشی'' کا عمل شیطان کا کام ہے۔ خوشحال اور گوپال دو ایسے ہی مفسد نوجوان ہیں جو دو محبت کرنے والے جوڑے کو اپنی سرگوشی سے وسوسے میں ڈال دیتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں عاشق و معشوق کے مابین باتوں کی تکرار شروع ہو جاتی ہے اور محبت کو نفرت میں بدلتے کچھ دیر نہیں لگتی ہے۔ اس بات کی مشتاق وانی نے اپنے افسانہ ''سرگوشی'' میں بڑی مؤثر ڈھنگ سے منظر کشی کی ہے۔

اسی طرح، ''بابا کو کچھ ہو گیا'' اور ''ایک اہم سوال'' مشتاق کے ہلکے پھلکے موڈ کے مختصر افسانے ہیں جو ذائقہ بدلنے کے لیے چند منٹوں میں پڑھ کر محظوظ ہونے کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی نے اپنے مقصدی اور اصلاحی افسانوں کے ذریعے معاشرتی اور تہذیبی بحران کا اخلاقی اور مذہبی نظریے سے سدباب کرنے اور اس کے تدارک کی کوششیں کی ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی اخلاقی ناہمواری دیکھتے ہیں تو ان کا قلم فوراً چل پڑتا ہے اور پھر سماج کے ایسے افراد کی تادیب و تہذیب کے لیے وہ ان کی سرعام سرزنش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے بلکہ اصلاحِ معاشرہ کی خاطر ان کی بڑی سختی سے گرفت بھی کرتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی کے افسانے تکنیکی اعتبار سے تمہیدی کلمات اور کرداروں کے تعارف سے شروع ہوتے ہیں اور ایک سیدھے راستے پر چلتے ہوئے اپنے نقطۂ منتہا پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں استعجاب اور تحیر جیسے عناصر زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ اپنی بات بہت ہی سادگی، دلچسپی اور خوبصورتی کے ساتھ قارئین کے ذہن نشین کرا دیتے ہیں۔ ان کے اکثر و بیشتر افسانوں میں کردار بہت جاندار اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کرداروں کا تعلق وادیٔ کشمیر سے ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی جزئیات نگاری میں وہ بہت انہماک سے کام لیتے ہیں۔ جس سے کردار کو

اس کے ماحول سے جوڑ کے دیکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مشتاق احمد وانی کے اسلوب اور زبان و بیان سے کشمیریت بخوبی مترشح ہوتی ہے۔ مکالمات کی ادائیگی سے کرداروں کی سماجی حیثیت (Status) کا بھی پتہ لگتا جاتا ہے۔

مشتاق احمد وانی کا سماجی اور سیاسی شعور بہت بالیدہ ہے۔ زندگی سے متعلق ان کے تلخ و شیریں تجربات بھی کافی گہرے ہیں۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور افسانہ نگار جو اپنی انفرادی بصیرت بھی رکھتا ہو، ہمیں توقع ہے کہ مستقبل میں وادیٔ کشمیر کا روشن ستارہ بن کرار دو افسانے کو بلندیوں تک پہنچانے میں اہم رول ادا کرے گا۔

■❖■

ڈاکٹر الطاف انجم
(اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، فاصلاتی نظام تعلیم کشمیر یونیورسٹی)
09419763548

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا جہانِ افسانہ

دنیائے اُردو میں کچھ لوگ ایسے بھی واقع ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے مشاہدے کی گہرائی، فکری بساط اور فنی دروبست کے امتزاج سے بہت جلد اپنے قارئین کو مناسب حد تک متاثر کر دیا، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا تعلق بھی تخلیق کاروں کی اسی قبیل سے ہے۔ انہوں نے اگرچہ نہایت ہی کم سنی میں داخلی سطح کے میلانات ور جحانات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کا فن سیکھا تھا لیکن اُن کی آواز ذرا دیر بعد ادبی حلقوں میں سنی اور پہچانی گئی۔ موصوف بیک وقت افسانہ نگار، ناول شناس، محقق، تنقید نگار ہونے کے علاوہ ادبی صحافی بھی ہیں اور اُردو کے موقر اور ممتاز رسائل و جرائد میں تواتر کے ساتھ اپنی ہشت پہلو ادبی تخلیقات کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور باذوق قارئین سے دادو تحسین وصول کر رہے ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعہ جات تا حال منصۂ شہود پر آچکے ہیں جنھوں نے افسانہ پسند قارئین سے خاطر خواہ انداز و اسلوب میں پذیرائی حاصل کی ہے۔ زیر ترتیب مجموعہ ''اندر کی باتیں'' ڈاکٹر وانی کی تیسری افسانوی سوغات ہے جو سابقہ دو مجموعہ جات کے مقابلے میں اس اعتبار سے اہم اور قابل توجہ ہے کہ اس میں افسانہ نگار فکری تنوع مندی، جمالیاتی حسیت، لسانی اہلیت (Linguistic Competence) اور معاشرتی شعور کی پختگی کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

''اندر کی باتیں'' بارہ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے جس میں افسانہ نگار نے ذاتی

تجربات و مشاہدات اور تصورات و مفروضات کو تخلیقی کینوس پر اتارنے کی کوشش کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں ایک قاری کو محبت کے جلتے بجھتے جذبات کی کہکشاں بھی نظر آتی ہے اور سماجی نابرابری کی غیر مختتم کڑیاں بھی، ازدواجی زندگی کی حقیقی اور رومانی صورتِ حال بھی ہے اور اس دنیا کے فانی تصورات کی تخم ریزی بھی۔ ''جسم خور کیڑا'' میں انہوں نے تصورِ وقت کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ افسانوی رنگ میں رنگ دیا ہے اس کے لیے افسانہ نگار کی فکری پختگی کا دل سے قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس میں میاں بیوی غلام عباس اور نوری کے کرداروں کے ذریعے وقت کے مضبوط بہاؤ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

''غلام عباس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے، ''نوری! مجھے وقت کے گزرنے کا احساس اندر ہی اندر نوچتا اور جھنجھوڑتا ہے کبھی کبھی یہ تمنا کرنے لگتا ہوں کہ کاش! وقت کی رفتار تھم جائے اور تغیر نام کی کوئی چیز دنیا میں نہ رہے۔ میں جوان رہوں اور تم بھی جوان رہو! ہم دونوں حسن و عشق کی ڈور میں یوں بندھے رہیں کہ یہ ڈور کبھی ٹوٹنے نہ پائے! مگر یہ سب کچھ چاہتے ہوئے بھی ہم دونوں وقت کے آگے بے بس و مجبور ہیں! کیوں کہ وقت جیسے دیو ہیکل کے سامنے کوئی بھی نہیں ٹک سکا ہے۔ اس نے آج تک سب کو تہس نہس کر دیا ہے۔ یہ بڑی بے دردی سے سب کو روندتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں۔''

یہ اقتباس دراصل افسانہ نگار کے تصور زماں کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں دور حاضر کا ایک عام انسان بھی اپنا عکس احسن طریقے سے دیکھ سکتا ہے۔ وقت کی تند اور تیز لہروں کی رفتار ہر زمانے میں گزشتہ کے مقابلے میں تیز ہی رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس افسانہ کے اولین قاری کی حیثیت سے میں ذاتی طور پر افسانہ نگار کے ساتھ خیالات کی سطح پر ہم آہنگی محسوس کرتا ہوں۔ اسی طرح ''ایک اہم سوال'' میں لوٹ کھسوٹ اور دنیوی ظاہر داری پر مبنی کچھ واقعات کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ہمیں یہ اپنی ہمسائیگی کا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بدرالدّین کے کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ

حرام مال و دولت سے تجوریاں بھر کر ایک انسان متاعِ دنیا میں کس قدر اندھے پن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔حرام کمائی سے بھری ہوئی تجوریاں لٹنے کے باوجود بھی بدرالدّین ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ جب اس کے گھر پر لوگوں کا جمِ غفیر جمع ہوتا ہے تو وہاں پر موجود ایک عالم اور صالح نوجوان خواتین و حضرات سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''خواتین و حضرات! آپ میں سے تقریباً بہت سے افراد کا یہی کہنا ہے کہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں دن رات جو کروڑوں ٹن شراب پی جاتی ہے، لاکھوں زنا کے اڈے قائم ہیں۔ اس کے علاوہ رشوت، ظلم و استحصال، چیزوں میں ملاوٹ، ہیرا پھیری، دھوکہ و فریب، حق تلفی، ڈاکہ زنی، غنڈہ گردی، شکم مادر میں بیٹیوں کا قتل، حقوق اللہ اور حقوق العباد سے چشم پوشی غرضیکہ یہ سب کچھ کیا خدا کرواتا ہے؟ میں آپ سے اس اہم سوال کا جواب چاہتا ہوں۔''

لیکن اس سب کے باوجود بدرالدّین تھانے میں رپورٹ لکھوانے پر بضد ہے۔

بنیادی طور پر افسانہ نگار اپنے قارئین کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادراک و عرفان سے واقف کرانا چاہتا ہے اور اس دوران وہ مادّی کشمکش اور مسابقتی اندازِ زیست کی مثالیں فراہم کرتے ہیں جن سے دورِ حاضر کا ہر شخص کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوا ہے۔ ''باغی'' نام کا افسانہ سماجی بندھنوں کو توڑتا ہوا ایک غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے سماجی اور معاشرتی شعور کو بروئے کار لا کر اس کہانی میں جان ڈال دی ہے۔ کومل اور جیون داس کے آپسی تال میل کے ذریعے افسانہ نگار نے اُن مسائل و مصائب کا اظہار کیا ہے جن کا سامنا ہر اُس شخص کو یہاں پر ہوتا ہے جو ذات پات، رنگ و نسل، دھن و دولت کے قائم کردہ خطوط کو ذرا سا بھی پار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کومل کا جرم صرف اتنا ہوتا ہے کہ اُس کو قدرت نے ایک رام داسی گھر میں پیدا کیا تھا جسے برہمن پست ذات گردانتے ہیں۔ ان واقعات سے افسانہ نگار کے قلب و ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اس لیے وہ یہاں پر اپنے داخلی درد و کرب کو مختلف کرداروں کے ذریعے ظاہر کرنے کی کامیاب کوشش کرتے

ہیں۔ ویسے بھی ذات پات پر مبنی سماجی ڈھانچہ (Social Structure) حساس اور دانشمند حضرات کے نزدیک طبقاتی تقسیم کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے جسے کسی بھی طرح لائقِ تحسین نہیں کہا جا سکتا ہے اور اس کو یہاں پر افسانہ نگار نے بھی معطون کیا ہے، جس کا عندیہ ان کے اس اقتباس سے ملتا ہے:

''جب وہ سماج میں ذات پات میں بٹے لوگوں کو دیکھتا یا مذہب اور دھرم کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم اور تصادم دیکھتا تو اس کا دل اندر ہی اندر چھلنی ہو جاتا اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا کہ نسل آدم اعضائے بدنی کے اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک ایک منہ ایک زبان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں، دو پاؤں اور خون میں بھی کوئی فرق نہیں بالکل سرخ رنگ کا، تو پھر یہ ہندو مسلمان، سکھ عیسائی، بدھ اور جین کے علاوہ بے شمار ذاتوں اور عقیدوں میں بٹا یہ انسان آخر کیوں؟''

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک آتے آتے اطلاعاتی تکنالوجی کی ہوش رُبا ترقی نے زندگی کی جملہ قدروں کو یکسر بدل دیا لیکن اس کے باوجود بھی ہمارے سماج میں رنگ و نسل کی سیاست اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ مذکورہ افسانہ کا پلاٹ انسانی کدورتوں کو دھو دینے کا کام کر سکتا ہے بشرطیکہ انسان ہر صورت میں اپنی آنکھوں کو کھلا رکھے۔ بقولِ غالب ؎

بخشے ہے جلوۂ گُل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے زیرِ ترتیب افسانوں میں اپنی لسانی مہارتوں کا خوب صورت طریقے سے استعمال کیا ہے۔ زبان کو تخلیقی سطح پر برتنے کا معاملہ کلی طور پر فن کار کے انفرادی مشق و مہارت اور اکتسابِ فیض پر منحصر ہے۔ موصوف اس وجہ سے مبارک بادی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ممکنہ طور پر زبان کو تخلیقی انداز میں برتنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری کا بھی کہیں کہیں پر مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھئے:

''اس کی بیوی میناکشی انتہائی حسین تھی۔ بوٹا قد، لمبیری گھنیری سیاہ زلفیں، بڑی بڑی آنکھیں، دمکتے بھرے بھرے رخسار، موتیوں کی لڑی ایسے دانت، گلاب کی پنکھڑی ایسے ہونٹ، ستواں ناک، صراحی دار گردن، مخروطی انگلیاں، جھلمل کرتی ہوئی چوڑیاں، اس کا تھل تھل کرتا وجود نہایت دلکش تھا۔''

اسی طرح انہوں نے ''باہر اور اندر کا منظر'' کی تمہید باندھتے ہوئے قدرت کے مناظر کی عکاسی جس خوب صورت انداز میں کی ہے وہ پڑھنے اور پڑھنے کے بعد داد دینے سے تعلق رکھتا ہے:

''یہ دکان ایک ایسے مقام پر واقع ہے جو قدرتی ماحول و مناظر سے آراستہ و پیراستہ ہے.................. دیودار کے سدا بہار جنگلوں کا ایک لامتناہی سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے، طرح طرح کے پرندوں کی بولیاں اُن کی روح پرور چہچہاہٹ اور پھر خاص کر موسمِ بہار میں چاروں جانب ہریالی اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے، سوہن، چمپا، جُوہی، کیوڑا، گلاب اور مولسری جیسے پھولوں کی رنگت اور خوشبو سیاحوں کے دماغوں کو معطر اور روحوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔''

اس مجموعہ میں ایک افسانہ ''اندر کی باتیں'' سوانحی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے جس میں یونیورسٹی میں خیالو رام کے تقرر کے لیے غیر اخلاقی، غیر علمی اور غیر قانونی حربے اختیار کیے جانے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ویسے دورِ حاضر کے دانش کدوں میں علم و عرفان کی بجائے جہالت و گمراہی کے عناصر ہی پروان چڑھتے نظر آتے ہیں اور آئے دن اخباروں کے کالموں اور ٹیلی ویژن چینلوں پر ایسی خبریں گشت کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ڈاکٹر مشتاق کی محنتِ شاقہ، علمی صلابت اور تخلیقی جودّت کے امتزاج سے جس فکری جوہر کی ترتیب و تہذیب ہوئی ہے، اُس کی خاطر خواہ انداز میں قدردانی کا حق ادا تا حال نہیں کیا گیا اور بیشتر موقعوں پر خیالو رام جیسے نااہل اور بے علم شخص کو موصوف پر اس لیے ترجیح دی گئی کہ وہ اربابِ اقتدار خودان کی علم و ادب شناسی کے سامنے اپنا چراغ نہیں جلا

سکتے تھے، اس لیے ان کو ہر بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ زیر نظر افسانے میں انہوں نے نریش رانا، کمل کانت، چترنجن باسو، خیالو رام، منوج اگروال، کلدیپ سنگھ، کندن لال جیسے کرداروں کے ذریعہ سے جامعات میں تقرری کے حالات و واقعات بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس نوعیت کے افسانے کو موثر اور کامیاب بنانے میں جہاں وسیع مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے وہیں ذاتی تجربہ بھی اس کو کندن بنا دیتا ہے۔ ویسے بھی تخلیقی فن پارہ ثقافتی کوڈز اور کنونشنز کا مظہر ہوتے ہوئے بھی فن کار کے نفسیاتی رموز وکوائف کا آئینہ ہوتا ہے۔ اب فن کار کا ہر فن پارہ کلی طور پر نہ سہی لیکن جزوی طور پر وہ اپنے خالق کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ ''اندر کی باتیں'' میں ڈاکٹر مشتاق نے کمل کانت کی زبان سے جس داخلی درد و کرب اور انتشار و اضطراب کا اظہار کیا وہ آج کل کے کچھ بیہودہ اشخاص کی گھناونی حرکتوں پر دال ہے۔ شعبہ تاریخ کے سربراہ چترنجن باسو کے بارے میں ہوٹل مالک نریش رانا جب یہ کہتا ہے کہ:

> ''مجھے معلوم ہے کہ جب وہ ممتحن بن کے کہیں جاتا ہے تو کال گرل بُک کرواتا ہے اور ایسی مدرا کی خواہش میں رہتا ہے جس کے پینے سے آدمی کی آنکھیں دن کو ہی تارے گننے لگتی ہیں اور وجود زمیں پر ڈھیر ہونے لگتا ہے''

تو قاری اس قدر مبہوت ہوتا ہے کہ بار بار ایسے کردار کو ملعون و معطون ٹھہراتا ہے۔ اسی طرح جب چترنجن باسو اپنے چیلے خیالو رام کی سفارش ممتحنین سے کرتا ہے تو دار العلوم کے اربابِ اختیار اور قواعد و ضوابط سے عام انسان کا ایمان اٹھ جاتا ہے:

> ''میری آپ سے یہ گزارش ہے کہ یہ نوجوان اسے سر سے پیر تک دیکھ لیجئے اس کا نام خیالو رام ہے۔ اس کا انتخاب ہونا چاہیئے۔ یہ ہسٹری میں ایم۔ فل، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ہے نہایت شریف دیانت دار اور محنتی ہے۔ اس لیے آپ نے اسے کل انٹریو میں جو کچھ بھی پوچھنا ہے اسے وہ سب کچھ بتا دیجئے۔ کوشش کیجئے کہ اس کی تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم، والدین کا نام، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ

اور پی۔ایچ۔ڈی کا موضوع کیا تھا؟ اس سے آگے سوالوں کا سلسلہ
نہ بڑھے ورنہ اس شریف آدمی کی زبان لڑکھڑا کر رہ جائے گی۔ بڑی
مشکل سے اسے لے کر آپ کے پاس پہنچا ہوں میری آپ سے یہ
بھی گزارش ہے کہ کمل کانت نام کا ایک اور امیدوار کافی پھرتیاں
مارتا ہے۔ اُس کا انتخاب نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ میری تمام پلاننگ
خاک میں مل جائے گی۔"

ڈاکٹر وانی کے افسانوی کینوس پر جو عناصر ظاہر ہوئے ہیں وہ اپنی گونا گوں
کیفیات کی وجہ سے حد درجہ قابلِ توجہ ہیں۔ انہوں نے اس اقتباس میں بعض جامعات
میں ہو رہی دھاندلیوں کا جو پردہ فاش کیا ہے وہ سماج کے سربرآوردہ اشخاص کو ہوش کے
ناخن لینے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح کے حالات و واقعات ہر کسی تعلیمی ادارے میں واقع
نہیں ہوتے ہیں لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ہر جگہ دودھ کے دھلے ہوئے لوگ بیٹھے ہیں۔
چترنجن باسو جیسے افراد نہ صرف تعلیمی دانشگاہوں کا معیار ملیا میٹ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں
بلکہ وہ زندگی کے دوسرے شعبہ جات میں بھی رخنہ انداز ہوتے رہتے ہیں۔

آج کا حساس تخلیق کار دراصل معاشرے کی ایک بیش بہا نعمت ہے جو افلاطون
کے نظریات کے برعکس سماجی اقدار اور مثبت رویّوں کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتا
ہے۔ ڈاکٹر وانی کی زیر بحث کہانیوں کے اکہرے اور عمیق مطالعہ سے قاری کو پہلی ہی نظر
میں ان کی اخلاقیات سازی کی طرف ذہن مائل ہوتا ہے۔ زیر ترتیب کہانیوں کا خمیر ہی
معیاری اقدارِ حیات سے تیار ہوا ہے جس کا اندازہ قدم قدم پر ہوتا ہے۔ ان کی یہ ساری
کہانیاں شر پر خیر کی فتح کا عندیہ دیتی ہیں۔ "اندر کی باتیں" میں چترنجن باسو اخلاق سوز
حرکات اور غیر علمی و غیر قانونی کارروائیوں کی وجہ سے عمر کے اُس حصے میں بے دست و پا
ہو گیا جس میں مستعد ہوش و حواس اور تاب و تواں ہر انسان کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔
افسانہ نگار نے مظلوم و محکوم کمل کانت کی آہوں و سسکیوں کے اثر سے ظالم و زانی چترنجن باسو
کا انجام اس طرح رقم کیا ہے:

"بالآخر اُس کی آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کو بھگوان کے دربار میں شرفِ

قبولیت حاصل ہو گیا، اِدھر کمل کانت کا جاپ پورا ہوا، اُدھر چترنجن باسو کے ہاتھوں اور پیروں میں بے حسی پیدا ہو گئی اور پھر جب وہ شہر کے مشہور ماہرِ امراض ڈاکٹر یوگیشور کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے اُسے بڑے دکھی لہجے میں کہا:

''باسو صاحب! آپ کے جسم میں کوڑھ کی بیماری نے ڈیرہ ڈال دیا ہے!''

تخلیقی فن اپنی اصل میں ایک جمالیاتی سرگرمی ہے جو فن کار کے خارجی تجربات و مشاہدات اور داخلی احساسات و مفروضات کا ایک ایسا خوب صورت امتزاج ہوتا ہے کہ ہر باذوق انسان اس فن پر دادو تحسین ادا کرنے کے بعد فن کار کے داخل میں رونما ہونے والی مختلف کیفیات کو محسوس کرنا چاہتا ہے جس میں وہ اکثر و بیشتر ٹھوکریں کھاتا ہے کیوں کہ 'انسان کا داخل ایک ایسی دنیا ہے جس کا کولمبس ابھی تک پیدا نہیں ہوا' مگر اس فن کار کا متن ثقافتی تشکیل ہونے کے باعث معاشرے کے اجتماعی لاشعور میں پیوست حسن کی جملہ کیفیات کا مظہر ہوتا ہے اور اس طرح قاری فن پارہ میں نہاں اور عیاں جمالیاتی محاسن کی تہوں اور طرفوں تک رسائی حاصل کر کے اپنے ذوق کی تسکین و تکمیل کر سکتا ہے۔ زیرِ ترتیب مجموعہ میں ڈاکٹر وانی نے حسن کی رعنائیوں کا ذکر بھی خوب کیا ہے گرچہ وہ افسانوں کا مجموعی یا بنیادی موضوع نہیں ہے لیکن وہ اپنی جمالیاتی حِس کا شعوری یا غیر شعوری اظہار کرنے سے باز نہیں رہتے۔ چوں کہ عورت حسن و جمال کا منبع ہے اس لیے وہ اسی کا ذکر کر کے اپنی نازک حِسیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ افسانہ ''آنکھوں کی عصمت دری'' میں حسن کی کرشمہ سازی کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

''جب وہ صبح اپنے دفتر کی طرف نکلتے تو راستے میں ایک کمہارن اپنی دکان پر سجی سنوری بیٹھی دکھائی دیتی جس کے بال بکھرے ہوئے، کندھوں تک موٹی ننگی باہیں اور قمیض کا گلا اتنا نشیبی کہ اُس کی معمولی جنبش سے قدرت کا انمول خزانہ ہمک ہمک کے باہر آنے کو ترستا۔''

معاشرے کے مختلف مسائل و مصائب اور رجحانات و میلانات کو تخلیقی سطح پر برتنے کا ہنر مشتاق کو خوب آتا ہے کیوں کہ ان کے یہاں زبان پر مناسب دست رس ہونے کا احساس ملتا ہے۔ موصوف چوں کہ ہندی اکثریت والے علاقے میں اپنی صبح کو شام

کرتے ہیں اس لیے ان کی تخلیقی زبان میں ہندی الفاظ کا استعمال کوئی غیر فطری بات نہیں ہے بلکہ یہ اپنی زمین اور اس میں پیوست جڑوں کے ساتھ مناسبت کی ایک عمدہ مثال ہے جسے ساختیات (Structuralism) کے حوالے سے ثقافتی کنونشنز سے وابستگی کا ایک مظہر تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں موقع و محل کی مناسبت سے زیر ترتیب افسانوی مجموعہ میں ہندی کے کچھ الفاظ کے استعمال پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا بیجا نہ ہوگا:

☆ تو نے پورے خاندان کی عزت خاک میں ملادی۔ میرا دھرم بھرشٹ کرے گا۔
☆ من بھاری ہونے لگتا ہے اک اگنی سی ہر وقت شریر میں جلتی رہتی ہے۔
☆ دکھیاری میناکشی شرما آج سنسار والوں سے ہمیشہ کے لیے وداع ہو رہی ہے۔
☆ دونوں کے دلوں میں نہ جانے کب سے ایک دوسرے کے تئیں پریم رس کی دھارا نے ہلچل سی مچادی تھی۔
☆ پڑوس کے پنڈتوں کا چھورا میری کاپی پر پیار کا شبد لکھے ہے۔
☆ اُس رنڈوے کے ہاتھوں میں کیسے تیری کاپی پہنچی۔
☆ اپنی دھرم پتنی سے بھوگ ولاس کرنا پاپ نہیں ہوتا ہے۔
☆ وہ بچّوں کو ڈانٹتے اور اُنھیں آستھا، سنسکار اور ست سنگ جیسے دھارمک چینل دیکھنے پر مجبور کرتے۔
☆ کسی کٹھنائی کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟
☆ باسو صاحب! آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کیسی چنتا! بس سب کُشل منگل ہے۔
☆ بقیہ امیدوار اس کے ارد گرد ایسے جمع ہو جاتے کہ جیسے وہ چار دھام کر کے آیا ہو۔

اس نوعیت کی وافر مثالیں زیر ترتیب مجموعہ میں دیکھی جا سکتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے متذکرہ بالا مثالوں پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔ یہاں پر افسانہ نگار کے ذخیرۂ الفاظ کو ذہن میں رکھیں تو انھیں اپنے معاصرین میں نمایاں مقام تفویض کیا جانا لازمی ہے جس کی وجہ سے ان کی افسانہ نگاری کی طرف خاطر خواہ توجہ کی جائے گی اور کئی اور تہیں اور طرفیں منکشف ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے میں ذاتی طور پر اس

بات کا اظہار کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس میدان میں ان کے مقام و مرتبہ کے تعین میں اُن کے دوسرے نمائندہ کارناموں پر حرف نہیں آنا چاہیئے۔ ''اُردو ادب میں تانیثیت'' ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس نے ادبی حلقوں میں مناسب حد تک پذیرائی حاصل کی ہے۔ میں صمیمِ قلب سے ڈاکٹر وانی کو زیرِ ترتیب افسانوی مجموعہ کی اشاعت کے لیے تہنیت پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ ان کے دوسرے ادبی کارناموں کی طرح اس مجموعہ کی بھی باذوق ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔

■❖■

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی
(پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ)
08863968168

مشتاق احمد وانی کی افسانہ نگاری

ریاست جموں کشمیر کے ادبی منظرنامے پر ابھرنے والی جن آوازوں نے اردو قارئین کو فوراً اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں مشتاق احمد وانی کا نام اہم ہے۔ان کے افسانے ،مضامین اور تحقیقی سرگرمیاں تازہ کاری کے ساتھ محنت ،ایمانداری اور اعتماد کی قوتوں سے مزین ہیں۔

مشتاق احمد وانی صاحب کو افسانہ نگاری اور افسانوں کی تفہیم وتنقید سے خاص دلچسپی رہی ہے۔انہوں نے ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' کے موضوع پر ایک کامیاب تحقیقی مقالہ (برائے پی ایچ ڈی) تحریر کیا، جو فکشن کی تنقید وتحقیق میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔۔اس کے علاوہ ان کے مجموعۂ مضامین ''آئینہ در آئینہ''، ''اعتبار ومعیار'' اور ''شعورِ بصیرت'' میں کئی تحریریں ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو فکشن کی تخلیق وتنقید سے خاص رغبت ہے۔گذشتہ دو دہائیوں سے وہ خود افسانے لکھ رہے ہیں جو ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہونے کے علاوہ دو افسانوی مجموعوں کی شکل میں بھی منظر عام پر آکر قارئین سے داد تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کے افسانوی موضوعات کی وسعت، اسلوب کی تازہ کاری اور مشاہدے کی گہرائی معاصر افسانہ میں انہیں ایک الگ مقام عطا کرتی ہے۔

مشتاق وانی کے افسانے سب سے پہلے اپنے وسیع کینوس کی وجہ سے ہمیں متاثر

کرتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ موضوعاتی طور پر ہمیں پرانی قدروں کے ساتھ ساتھ نئی دنیا اور نئے آفاق سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ بم دھماکے، کشمیر کا مسئلہ، بڑھتی ہوئی آبادی، فرقہ واریت کے معاملات، مذہب اور علاقائیت کے نام پر فسادات، ریپ کے انسانیت سوز واقعات، رشوت کی گرم ستانی، سیاسی قدروں کی پامالی، تشدد اور جنسی تشدد کی بھیانک شکلیں، سیاسی بازیگروں کا لسانی تشدد کی بنا پر علاحدگی کی فضا قائم کرنا، ذات پات اور بھید بھاؤ کے نام پر عوام کو تقسیم کرنا، بے ہودہ رسوم ورواج، نوجوان نسل کا تمام اخلاقی اقدار کو پامال کرنا، تعلیمی اداروں میں نظم وضبط کی کمی، جنسی ہیجان انگیزی، فحاشی، بے حیائی اور حرام کاری کی طرف انسان کے بڑھتے قدم، نمود ونمائش اور حرام خوری ایسے موضوعات کو مشتاق وانی اپنی کہانیوں میں بڑی شدت اور حقیقت کے ساتھ برت رہے ہیں۔ دراصل مشتاق وانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کمال ہشیاری سے واشگاف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا منظر نامہ پرانی قدروں کے تحفظ کے ساتھ نئے فلسفوں اور نئے حقائق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ تلاش کہاں تک پہنچے گی، ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن سچائی کے ساتھ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کہانی سپاٹ بیانیہ کا شکار نہیں ہے۔ ایک طرف جدت اور حقیقت پسندی کے امتزاج سے نئے کولاژ تعمیر کر رہی ہے تو دوسری طرف تیزی سے بدلتی دنیائیں ان کی کہانیوں کا موضوع بن رہی ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان کی افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے شاید اسی لیے لکھا ہے کہ

> ''اُن کی انگلیاں معاشرے کی نبض پر ہیں اور ان کی کہانیاں آج کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں بالخصوص اخلاقی قدروں کی شکست وریخت، انسانی رشتوں کا بکھرنا، بزرگوں اور ان کی اولادوں کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ، خود غرضی لالچ اور کاروباری ذہنیت کا فروغ، نیز سماجی سطح پر لڑکیوں کی ناقدری اور ان کے جذبات کے تئیں عزیزوں، رشتہ داروں کی بے حسی، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی سماج کے فاسد مادے کے معالج ہیں اور ان کی کہانیاں ترسیل، تاثیر اور دردمندی کے اعتبار سے توجہ چاہتی ہیں۔''

میٹھا زہر، ہزاروں غم، باغی، دوہری مار، فتنہ، اندر کی باتیں، پانچ سال کا بن باس اوراس طرح کی بہت ساری کہانیاں پڑھ کر آپ بہ آسانی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مشتاق احمد وانی کو موضوعاتی کہانیاں لکھنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ اُن کے افسانوں میں تجربے، مشاہدے، حادثات اور واقعات کا بیان پورے کہانی پن کے ساتھ قائم رہتا ہے اور کہانی اپنے کرداروں کی زندگی کے اطراف گھومتی رہتی ہے۔ وہ اپنی موضوعاتی کہانیوں کے ذریعے آج کے سماج کو ایک سچا آئینہ دکھانا چاہتے ہیں جس میں جو بھی جھانکتا ہے اس کو اپنی اصل صورت نظر آتی ہے۔ ان کے کردار تخیل کی بھول بھلیوں سے جلوہ گر نہیں ہوتے بلکہ ہمارے آپ کے آس پاس ہی زندگی کے سکھ دکھ بھوگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کسی خاص رجحان یا ازم کے تابع نہیں ہیں۔ پیش کش کی سطح پر بھی ان کی افسانہ نگاری انتہائی سادہ اور سلیس ہے۔ سیدھی سادی زندگی کی کہانی، عام سے کردار، پلاٹ پیچیدگی سے پاک، تحیر، تجسس وتصادم بقدر ضرورت ، کہانیوں کا عام فہم اختتام قاری سے بے جا خطابت نہ ہی کسی خاص نظریہ کی اشاعت یہ تمام اوصاف انہیں سہل مگر موثر افسانہ نگار ثابت کرتے ہیں۔

اردو میں ہمیشہ اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی ہے کہ ادب کو مقصدی ہونا چاہیے یا نہیں؟ اِسی سوال نے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دو مشہور نعرے پیدا کیے اور اِسی سوال نے ایہام گوئی سے مابعد جدیدیت تک مختلف رجحانات اور تحریکات کی بنیاد رکھی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کوئی بھی تخلیق یا فن پارہ بغیر کسی مقصد کے وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ جو فن پارے جدیدیت کے دور میں لکھے گئے اور جن کا بظاہر زندگی یا افادیت سے دور دور کا رشتہ نہ تھا، اُن میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہے اور وہ اپنے مقصد کی تکمیل میں ایک حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق وانی کھلے طور پہ ادب کے مقصدی ہونے کے قائل ہیں اور ڈپٹی نذیر احمد کی طرح سماجی، معاشرتی اور خاندانی اصلاح کے لیے ادب کو ہتھیار بنانے کے طرف دار ہیں۔ ان کا نیا افسانوی مجموعہ ''اندر کی باتیں'' کا ہر قصہ اُن کی اسی فکر کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اس مجموعے کی تمام کہانیوں میں صحت مند قدروں کی عکاسی کی ہے اور انسان کے دکھ درد، محرومیوں، ناکامیوں اور اس کے زوال کا

مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سچ یہ ہے کہ مشتاق وانی اپنے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں عصرِ رواں کے تمام زخموں کی کراہ سنائی دیتی ہے۔ مگر خوبی یہ ہے کہ ان میں نا امیدی، مایوسی اور کم حوصلگی کے اندھیرے نہیں ملتے بلکہ حوصلے، ہمت اور کامیابی کی وہ روشنی ملتی ہے جو قاری کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔ اِن کہانیوں کے چند عنوانات سے ہی مشتاق وانی کی فکر اور اُن کے موضوعی انسلاکات کا اندازہ ہو جاتا ہے مثلاً ''جسم خور کیڑا''، سرگوشی، باغی، فتنہ، پانچ سال کا بن باس، ایک اہم سوال، چھپا سانپ، چہرہ چھپائے لوگ، آنکھوں کی عصمت دری، بابا کو کچھ ہو گیا ہے، باہر اور اندر کا منظر، اندر کی باتیں'' وغیرہ۔ یہ سب ایسی کہانیاں ہیں جو بغیر کسی ابہام و اہمال کے سادہ اور سلیس انداز میں اپنا پیغام ذہنوں پہ ثبت کرنے کی قدرت رکھتی ہیں۔ وہ اپنے پلاٹ کو معمہ نہیں بناتے اور نہ بیانیہ کو چیستاں میں تبدیل کرتے ہیں۔ اُن کی کہانیاں شروع سے آخر تک ایک واضح اور روشن راستہ بناتی ہیں جن پر قاری خراماں خراماں اپنا سفر طئے کر سکتا ہے۔

ناقدین کے شور شرابے سے دور ہو کر مشتاق وانی خود اپنی صحبت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی فکر، اپنے خیال کو کہانی کی بنیاد بناتے ہیں۔ اُن کے بیانیہ سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں، اُنکی کہانیوں کے تعلق سے آپ کی اپنی پسند ناپسند ہو سکتی ہے۔ ان میں سے کوئی اچھی، کوئی بری اور کوئی بہت اچھی یا بری بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جو ایک وصف ان کہانیوں میں مشترک ہے وہ اپنی سوچ اور تجربہ پر انحصار اور اس کا شخصی اظہار ہے۔ ان میں سب کی اپنی پہچان اور اپنا چہرہ ہے جو مشتاق وانی کی انفرادی شناخت پر اصرار کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ مشتاق وانی بہت حد تک قصہ گوئی کے فن سے واقف ہیں۔ زندگی میں رونما ہونے والے نوع بہ نوع واقعات کا انھوں نے نہ صرف گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے بلکہ خود اس کی تہ میں اتر کر اس کی تہ داریوں کا سراغ بھی لگایا ہے۔ ان کی یہ دریافت ان کے احساسات سے اس شدت کے ساتھ ٹکراتی ہے کہ وہ خود کو قلم و قرطاس کا سہارا لینے پر مجبور پاتے ہیں۔ اور جب جب یہ نوبت آتی ہے ان کا قلم کاغذ پر تلخ حقائق کا

ایک جنگل ترتیب دیتا ہے جہاں خاروخس برائے نام ہیں اور گل بوٹے افراط سے سجے ملتے ہیں۔فنی طور پر مشتاق وانی اپنے افسانوں میں بے جا طوالت سے گریز کرتے ہیں اور عبارت میں الجھاؤ پیدا نہیں ہونے دیتے۔زبان پر عبور حاصل ہے اس لیے پاک صاف ،شستہ اور خوبصورت بیانیہ دل کو موہ لیتا ہے۔مگر موضوع سے گہری وابستگی اور اصلاحی درس پہ زور کی وجہ سے واقعات فنی طور پر کہیں کہیں کہانی بننے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔افسانہ ایک تخلیقی فن ہے جو تخلیقی وفور،صناعی اور کرافٹ مین شِپ کا بھی تقاضہ کرتا ہے۔فنکاری و صناعی کی ایک ہلکی سی کمی کے باوجود یہ مجموعہ گرم جوشی کے ساتھ استقبال کے قابل ہے کہ یہ ایک سوچتے ہوئے ذہن،مضطرب وحساس دل اور بااسلوب قلم کار کی ادبی کاوش ہے۔

■❖■

ڈاکٹر رغبت شمیم ملک
(جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)
08715930191

مشتاق احمد وانی کا افسانہ ''اندر کی باتیں''

(قرأت اور ردِّ تشکیل)

مشتاق احمد وانی ایک سنجیدہ نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'ہزاروں غم' اور 'میٹھا زہر' منظر عام پر آچکے ہیں۔ تازہ مجموعہ 'اندر کی باتیں' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ انہوں نے جدید ادبی تھیوری 'تانیثیت' پر نہایت سنجیدہ تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کا یہ تحقیقی کام اردو میں 'تانیثیت' کا روشن چراغ ہے۔ بعد ازاں ان کے ہی تانیثی چراغ سے مزید چراغوں کے جلنے کا امکان ہے۔ ان کے ہاں تخلیقی اور تنقیدی دونوں دھارائیں مسلسل اور متوازی طور پر بہہ رہی ہیں۔ مشتاق احمد وانی غالباً پچیس تیس برسوں سے اس دشت کی سیاحی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان کا یہی انہماک اور سنجیدگی فن پارہ کو جلا بخشتی ہے۔ بغیر خون جگر اور سنجیدگی کے اعلیٰ اور اچھا فن پارہ وجود میں نہیں آسکتا ہے۔ مشتاق احمد وانی کے ہاں یہ دونوں صفات موجود ہیں۔

مشتاق احمد وانی اردو افسانہ کا منٹو نہیں ہے لیکن منٹو کی بے باکی اور حقیقت نگاری ان کے ہاں موجود ضرور ہے۔ ان کے افسانے ان کی ذاتی زندگی اور سماج دونوں کا آئینہ ہیں۔ وہ ذاتی تجربات اور مشاہدات سے اپنا تخلیقی بیانیہ خلق کرتے ہیں۔ زندگی اور سماج کے حقائق ان کے افسانوں میں بہ آسانی ڈھل جاتے ہیں۔ ان کے افسانے اپنے محاسن

ومعائر سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔

'اندر کی باتیں' میں چترنجن باسو، کمل کانت، خیالو رام، نریش رانا اور باہر سے آئے ایکسپرٹس منوج اگروال، کلدیپ سنگھ اور کندن لال کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔

پروفیسر چترنجن باسو شعبہ تاریخ میں صدر شعبہ ہیں۔ وہ اپنے کالے کرتوتوں کے لئے اپنی یونیورسٹی اور قرب وجوار میں مشہور ہیں۔ شراب اور شباب کو ان کی زندگی میں اولیت حاصل ہے۔ رشوت خوری اور کرپشن میں بھی وہ ایک قدم آگے ہیں۔ شراب اور شباب کے لئے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروفیسر چترنجن باسو اس کے لئے رشوت لیتے ہیں تا کہ ان کی مذکورہ خواہشات کی تکمیل ہو سکے۔ کہانی کے راوی کو نریش رانا بتاتے ہیں:

> ''کمل کانت میں یقین سے کہتا ہوں جتنا میں چترنجن باسو کو اندر اور باہر سے جانتا ہوں کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ میں جانتا ہوں کہ چترنجن باسو کو چار چیزیں بہت پیاری ہیں اور ان چیزوں کے حصول کی خاطر وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ چار چیزیں ہیں: مدرا، دھن، ناری اور چانڈو۔''

اکیسویں صدی زن اور زر کی صدی ہے۔ جس طرح سے بھی ہو اس کے حصول میں لوگ سرگرداں ہیں۔ پروفیسر چترنجن باسو بھی زن سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اپنے کپڑوں کی طرح زن کی تبدیلی کو بھی لازمی سمجھتے ہیں اور کیوں نہ ہو اس کے بغیر ان کی زندگی کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ جنس تو ان کے لئے ایک لذیذ کھانا کی طرح ہے جس سے وہ ہر بار رجوع ہونا چاہتا ہے۔ مدرا، زر، زن اور چانڈو ہی تو ان کی زندگی کا حاصل ہے۔ وہ اپنی ان ہی خواہشات کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ اس کی تکمیل کے لئے انہیں چاہے جو بھی کرنا پڑے منظور ہے۔ وہ سیاست کی دنیا میں بھی اپنی گہری گرفت رکھتے ہیں۔ اپنی ریاست کے تمام اکابرین کو رام بنانے میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ماڈرن سماج کے ہر ایک تال میل سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اپنے مکر وفریب سے سیاست داں ہو یا ادیب سب کو بہ آسانی اپنے چنگل میں پھنسانے کا گر جانتے ہیں۔

نریش رانا کے مطابق:

''کمل کانت سنو! چترنجن باسو بہت چتر آدمی ہے۔ وہ اہم سیاسی، ادبی اور سماجی شخصیات کو قابو کرنے کے لئے محفلیں منعقد کرتا ہے۔ پچاس روپے کا گلدستہ ہاتھوں میں تھما دیتا ہے، ڈیڑھ سو روپے کا شال کندھوں پر ڈال دیتا ہے اور اس منافقانہ انداز سے وہ ان کے روشن ضمیر کی کلغی دبوچ لیتا ہے۔ پھر وہ اس کی بداعمالیوں پہ لب کشائی نہیں کر پاتے۔''

خیالو رام کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ کہانی کا تانا بانا اسی کے لئے بنا گیا ہے۔ اس کی صلاحیت کے بارے میں کوئی رائے نہ رکھی جائے تو بہتر ہے۔ خیالو رام یونیورسٹی میں بٹر باز کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ وہ شعبہ کے ہیڈ کی ہر طرح سے خدمت کرتا ہے۔ وہ ان کے گھر والوں کی خدمت کا بھی خاص خیال رکھتا ہے۔ وہ اپنے کام اور کارنامے سے ایک پل بھی غافل نہیں رہتا ہے۔ بٹر بازی اور اساتذہ کا گھریلو کام کاج ہی اس کا وصف خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی میں اسامی کی جگہ پُر کرنے کا جب وقت آیا تو پروفیسر چترنجن باسو نے بھی اپنے خیالو رام کا خاص خیال رکھا۔ انہوں نے ہر طرح سے اس کا تعاون کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ہر کام کے پیچھے ان کا ذاتی مفاد شامل رہا ہے۔ خیالو رام نے اپنی بحالی کے لئے پروفیسر چترنجن باسو کے اکاؤنٹ میں ایک بڑی رقم جمع بھی کرادی ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے:

''ہم تینوں کمرے سے باہر آئے تو میں نے چترنجن باسو کو خیالو رام سے الگ لے جا کر تنہائی میں اپنی جگہ پوچھا ''باسو صاحب! آپ اس خیالو رام کے لئے کیوں اتنا تڑپ رہے ہیں وجہ کیا ہے؟ میں تو حیران رہ گیا یہ چکر کیا ہے؟''

چترنجن باسو نے نہایت اطمینان سے کہا:

''نریش رانا صاحب! میرے پاپوش کے تسمے کھولنے اور باندھنے سے لے کر میرے مکان میں پوچھ پھیر نے تک کون سا ایسا کام ہے جو خیالو رام نے نہیں کیا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ میں اس کا خیال

نہ رکھوں تو کس کا رکھوں؟ اور پھر اتنی ہی بات نہیں ہے اس نے تو اپنی
جمع پونجی بھی میرے اکاؤنٹ میں جمع کرادی ہے اب آپ ہی کہئے
کیسے انکار کروں۔"

کھوٹے سکے کو بیچنے کا فن بھی کمال کا فن ہوتا ہے۔ لوگ باگ کھرا سونا بیچنے میں بھی پریشان ہو جاتے ہیں لیکن وہ لوگ جن کا مقصد علم کی توسیع نہیں، وہ علم کی دیوی کی جگہ گنیش سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور علم کی دیوی سرسوتی کو کبھی بیچ بازار میں تو کبھی بند کمرے میں بیچ دیتے ہیں۔ بیچنے اور خریدنے کا کاروبار آج کل بہ آسانی چلتا رہتا ہے۔ ساری چیزیں پہلے ہی نیلام ہو جاتی ہیں۔ بعد ازاں ایک انٹرویو کا خوب صورت ڈھونگ رچا جاتا ہے ہ بکنے والے بھی کبھی نام نہاد پروفیسر ہوتے ہیں اور خریدنے والے میں یہی وجہ ہے کہ جامعات میں ہیڈ کی کرسی سنبھالنے کے لئے تصادم پر تصادم ہوتا رہتا ہے۔ یہی تو وہ کرسی ہے جہاں سے گنیش سے ملاقات کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ شعبہ کے ہیڈ اپنے امیدوار خیالو رام کی پیروی کس طرح کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

> "اگروال صاحب آپ کو معلوم ہی ہے کل پورے دس بجے دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کے آفس میں شعبۂ تاریخ کی اسامی کے لئے انٹرویو شروع ہو رہا ہے۔ آپ اس میں بحیثیت ماہر تاریخ موجود ہوں گے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ یہ نوجوان اسے سر سے پیر تک دیکھ لیجئے اس کا نام خیالو رام ہے اس کا انتخاب ہونا چاہئے۔ یہ ہسٹری میں ایم فل، پی ایچ ڈی ہے۔ نہایت شریف، دیانت دار اور محنتی ہے۔ اس لئے آپ کو اسے کل انٹرویو میں جو کچھ بھی پوچھنا ہے اسے وہ سب کچھ بتا دیجئے۔ کوشش کیجئے کہ اس کی تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم، والدین کا نام، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اور پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا؟ اس سے آگے سوالوں کا سلسلہ نہ بڑھے ورنہ اس شریف آدمی کی زبان لڑکھڑا کر رہ جائے گی۔ بڑی مشکل سے اسے لے کر آپ کے پاس پہنچا ہوں۔ میری آپ سے

یہ بھی گزارش ہے کہ کمل کانت نام کا ایک امیدوار کافی پھرتیاں مارتا
ہے۔ اس کا انتخاب نہیں ہونا چاہئے ورنہ میری تمام پلاننگ خاک
میں مل جائے گی۔"

کمل کانت اس کہانی کا سب سے اہم اور توانا کردار ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک اچھا امیدوار ہے۔ اس کی ڈگریوں میں ایم اے، بی ایڈ پی ایچ ڈی اور ڈی ایچ شامل ہیں۔ وہ بارہ کتابوں کا مصنف ہے وہ تیس سالوں سے تخلیقی اور تنقیدی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کے سینکڑوں مضامین ملک اور بیرون ملک کے اہم رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُس کے مضامین قارئین کے حلقے میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ نریش رانا کے لفظوں میں:

"باسو صاحب! کمل کانت نے اگر فارم بھرا ہے تو اس کی سلیکشن کی
جانی چاہئے۔ وہ ایک مستحق امیدوار ہے۔ کمل کانت کو ہم تیس برس
سے ہسٹری کے اہم اور معیاری رسائل میں پڑھتے آرہے ہیں۔ کمل
کانت نے ہندوستان کی جدید تاریخ پر جو کام کیا ہے وہ آج تک کسی
سے نہیں ہوسکا ہے۔ لہٰذا یہ میرے ضمیر اور اصول کے خلاف ہے بلکہ
ایک بڑا ظلم ہے کہ حق والے کو اس کا حق نہ دیا جائے۔"

یہ عجیب اتفاق ہے کہ موجودہ عہد کے باصلاحیت اسکالروں کی بحالی نہایت کم ہورہی ہے۔ ہر انٹرویو کا نتیجہ چونکائے بغیر نہیں رہتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بیشتر انٹرویو میں خیالورام کا ہی انتخاب ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہورہا ہے یہ بات غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔

مشتاق احمد وانی حقیقی زندگی کی کہانی گڑھنے کا فن جانتے ہیں۔ "اندر کی باتیں" محض ایک کہانی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ دراصل ایک انٹرویو کے المیے کی روداد ہے۔ انٹرویو کا یہ کھیل ہر یونیورسٹی میں نہایت خاموشی سے کھیلا جاتا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ کچھ لوگ خیالورام کے لئے اپنے ذہین ریسرچ اسکالر کو بھی دار پر چڑھانے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ آج جامعات میں دیالورام/اسکالر کم اور خیالورام بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ایک دور تھا کہ انٹرویو میں باصلاحیت لوگوں کا انتخاب زیادہ ہوتا تھا۔ اس وقت

انتخاب کرنے والوں کا حلقہ بھی علم کے جوہر سے مالا مال ہوتا تھا۔ وہ اپنے ادارے کے تئیں اچھے لوگوں کا انتخاب کرتے تھے۔ مونس رضا اس کی عمدہ مثال ہے۔ جنہوں نے علمی دنیا کو بپن چندر، رومیلا تھاپر، نامور سنگھ، محمد حسن وغیرہ جیسی شخصیات کا انتخاب کیا۔ اور کوئی بھی شخص ان کی صلاحیت پر انگشت نمائی نہیں کر سکتا۔ لیکن آج صورت حال مایوس کن ہے۔ اب معیار کی زیادہ اہمیت نہیں رہی ہے۔ اب انتخاب میں ذات، نسل، مسلک، علاقہ جیسی چیزوں کا عمل دخل بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ آج یہ چیزیں کم وبیش ہر جامعات کا وطیرہ بن چکی ہیں۔ اب کسی بھی پروفیسر کو دیالورام یا اسکالر کی نہیں خیالورام کی ضرورت ہے۔ یہی خیالورام ان کے ہر مرض کی دوا ہوتا ہے۔

موجودہ عہد میں سچ لکھنا نہایت کارِ مشکل ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل فکشن میں سچ لکھنا ہے۔ میرے خیال میں مشتاق احمد وانی سچے فکشن نگار زیادہ ہیں۔ زندگی ایک حقیقت ہے اور کہانی کا تعلق زندگی سے ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں کہانی ہے۔ بغیر زندگی کے کہانی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ کبھی کہانی زندگی میں ڈھل جاتی ہے تو کبھی زندگی کہانی میں۔ یہی آنکھ مچولی زندگی اور کہانی کے مابین چلتی رہتی ہے۔ کہانی انسانی خمیر اور سماج کا زائیدہ ہے۔

ہم ایک مسموم فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اب ہماری سوچ اور ہمارا طور سب کچھ زہریلا ہو گیا ہے۔ جنس اور زر کی دوڑ میں ہم بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اخلاق اور معیار کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ علم اور معیارات اب محض لغت میں کشاکش کی زندگی گزار رہے ہیں۔ رشوت خوری اور غلط کاری پوسٹ ماڈرن انسان کا وطیرہ بن گیا ہے۔ مصلحت پسندی، ذاتی مفادات کا بول بالا ہے۔ حق والوں کا حق چھین لیا جا رہا ہے۔ دانشوروں نے اپنا غلبہ بنائے رکھنے کے لئے نئی نسل کی زبان بندی کر دی ہے۔ سچ اور حق کی آواز بہ آسانی دبا دی جاتی ہے۔ معین الدین جینابڑے لکھتے ہیں:

"ایسے سماج میں کھرا ادب تخلیق کرنا اپنے ساتھ دار و رسن کو بھی آزمائش میں ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ سچ بولنا گھاٹے کا سودا قرار پاتا ہے اور حق کا نعرہ بلند کر کے کوئی ہیرو نہیں بن سکتا۔ مصلحتوں اور ذاتی مفادات کی عشق پیچاں، آزاد خیالی اور روشن

دماغی کے بل پر خوب پھیلتی ہیں اور اصل پیڑ بے ثمر رہ جاتا ہے۔ کوئی حیرت نہیں ہے کہ ہمارے یہاں دانشور ذہنوں کو تھپکیاں دینے کا کام کرتے رہے ہیں۔

جرات فکر کے بغیر اظہار کا حق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ معاشرہ فکر کو رہن رکھ لینے کے بعد اظہار کی آزادی دیتا ہے اور وسائل فراہم کرتا ہے۔ ایسے معاشرے میں دانشوری نہیں پنپ سکتی، دانشوری کا بکھان ہوسکتا ہے۔ خود اس کا ہونا معاشرہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کے ہوتے انسان کو بنیادی حقوق سے محروم نہیں رکھا جاسکتا۔''

مشتاق وانی کی کہانی سچ بولتی ہے اور ہر سچی کہانی کی اپنی معنویت ہوتی ہے۔ میں مشتاق احمد وانی کو ان کی کہانیوں کے وسیلے سے جانتا ہوں۔ ان کی کہانیوں میں ایک رمق ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں خود ان کی ذاتی زندگی کا انعکاس ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ ان کی کہانی سچ کو چھپاتی کم ہے، سامنے لانے کا کام زیادہ کرتی ہے۔

مشتاق وانی کی کہانی 'اندر کی باتیں' عصری حقائق کا بین ثبوت ہے۔ یہ ان کی ذاتی زندگی کے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ یہ کہانی کمل کانت کی زندگی کا المیہ ہے۔ یہ المیہ محض کمل کانت کا نہیں موجودہ عہد کے ہر اچھے اسکالر کا المیہ ہے۔ کس نے سوچا تھا کہ اکیسویں صدی میں دنیا اتنی بدل جائے گی۔ کرپشن اور جہالت کو اس صدی کا اختصاص تسلیم کرلیا جائے گا۔ تعلیمی اداروں میں کرشن چندر کے گدھوں کو باری باری بحال کرنے کی سعی کی جائے گی۔ مشتاق وانی کی کہانی میں خیالو رام ان ہی گدھوں میں سے ایک گدھا ہے۔ یہ خیالو رام ہندوستان کی ہر یونیورسٹی میں پایا جاتا ہے۔ البتہ ان کے نام دیگر یونیورسٹیوں میں دیگر ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک حقیقی واقعہ رقم کرتا ہوں:

پروفیسر نامور سنگھ کو بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ ہندی نے ایک میموریل لیکچر کے لئے مدعو کیا۔ پروفیسر نامور سنگھ نے وہاں ایک طویل پر مغز لیکچر پیش کیا۔ لیکچر کے دوران انہوں نے موجودہ ہندی کی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی۔ مزید انہوں نے یہ بھی کہا کہ ادھر دس پندرہ سالوں میں جن لوگوں کی جامعات میں بحالی ہوئی ان میں باصلاحیت لوگوں کی تعداد

خال خال نظر آتی ہے۔ سامعین ان کے بارعب لیکچر سے مبہوت تھے۔ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہیں ایک نہایت سنجیدہ اور خاموش طبیعت انسان کھڑا ہوا اور نہایت مودبانہ انداز میں پروفیسر نامور سے پوچھ بیٹھا۔ سر یہ بتایئے کہ بے صلاحیت لوگوں کو جامعات میں لانے کے ذمہ دار کون ہیں؟ نامور سنگھ اس سوال سے لب بہ دنداں ہو گئے۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کی بحالی کرتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے ہی خود اپنے گھر کو جلانے کا کام ان کے سپرد کیا ہے۔ اس میں ان نااہلوں کا بھلا کیا قصور ہے۔ ہمارے نام نہاد دانشوروں نے اپنے ذاتی تعلقات اور ذاتی مفادات کے لئے اپنی زبان اور اپنی تہذیب کو بھی ملیا میٹ کرنے سے گریز نہیں کیا۔ پروفیسر جاوید لکھتے ہیں:

> ''کئی جگہ دو اساتذہ کی تقرری میں مطالعہ، ذہانت اور صلاحیت کے بجائے جوڑ توڑ گروہ بازی اور سکہ رائج الوقت کا عمل دخل زیادہ اہم ثابت ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جدید تر سماجی اور ثقافتی تقاضوں کی روشنی میں ادب کی تدریس گنے چنے شعبوں میں ہو رہی ہے۔''

دنیا پہلے بھی بدلتی تھی لیکن یہ دنیا پانچ دس سالوں میں اتنی بدل جائے گی اس کا کسی کو وہم و گمان نہیں تھا۔ آج انسانی قدریں نہایت تیزی سے مٹتی جا رہی ہیں۔ برائیاں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ جنس اور زر بیشتر انسانوں کا مقدر بنتا جا رہا ہے۔ ہر چیز کی خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ علم اور ہنر بے وقعت اور بے معنی ہوتے جا رہے ہیں۔ اندھے کو علم بانٹنے کا کام دیا جا رہا ہے۔ اس کا احساس ہمارے عہد کے بیشتر دانشوروں کو ہے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہمارے دانشور بالکل خاموش ہیں۔ وجہ چاہے اس کی جو بھی ہو۔ اردو کے سنجیدہ نقاد اور دانشور شمیم حنفی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''مہذب دنیا کے کسی بھی دور میں انسانی معاشرہ اس حد تک بے لگام نہیں ہوا تھا۔ ہم سب ایک گناہ گار معاشرے کے افراد ہیں اور ہمارا احساس گناہ ختم ہو چکا ہے۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ ہمیں اپنے انحطاط اور بے راہ روی کا اندازہ تک نہیں۔''

فکشن کی سچائی بنیادی طور پر زندگی کی سچائی ہے۔ مشتاق احمد وانی خود اردو کے اسکالر ہیں۔ وہ بھی پروفیسری کے لئے اپنی قسمت آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سانحہ خود ان کی زندگی میں پیش آیا ہو۔ جو ان کی کہانی میں کمل کانت کا دھارن کر گیا ہو۔ اور کہانی بالکل حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ کمل کانت کا المیہ خود مشتاق احمد وانی کی زندگی کا المیہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کو مشتاق احمد وانی نے کمل کانت کے قالب میں ڈھال دیا ہو یا یہ کسی اور اردو کے اسکالر کا سانحہ ہوسکتا ہے جو فکشن کا روپ دھارن کر گیا ہے۔

یہ محض ایک خیالو رام کی کہانی نہیں ہے۔ یہ نام نہاد پروفیسر کے اخلاقی گراوٹ کی بھی کہانی ہے۔ اے پی جے ابوالکلام نے سچ کہا ہے کہ سماج میں اگر دو لوگ صحیح ہو جائیں تو سماج سے کرپشن اور دیگر برائیاں ختم ہوسکتی ہیں یعنی والدین اور استاد۔ والدین کے ہاں خود آج اخلاقیات کا فقدان ہے۔ وہ اپنے بچوں کو بھی اخلاقیات کی تعلیم دینے سے گریز کرتے ہیں۔ آج اساتذہ کا حال بھی زیادہ اچھا نہیں ہے۔ علم کی جگہ ان میں بھی مادیت تحلیل ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج سے اساتذہ کا وقار جا تا رہا ہے۔

آج اساتذہ بڑی تعداد میں اخلاقی طور پر اپاہج ہو چکے ہیں۔ اساتذہ جن پر کل دنیا فخر کرتی تھی آج انہیں حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ مارکیٹ کلچر کا اثر کچھ اساتذہ پر بھی حد درجہ نمایاں ہے۔ ان کو اب طالب علموں کو بہتر تعلیم سے آراستہ کرنے کی فکر نہیں ہے۔ اب انہیں اضافی آمدنی کی فکر زیادہ ہے۔ وہ اپنی اضافی آمدنی کے لئے کبھی سمینار کبھی ورکشاپ اور کبھی ریڈیو ٹیلی ویژن کے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ اب دولت کا حصول ہی ان کی زندگی کا عظیم مقصد ہے۔ بعد ازاں یہی اساتذہ اسامیوں کے پُر کرنے کے دوران گنیش سے ہاتھ گرم کرنے میں بھی فراخ دلی سے کام لیتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی ایک بیانیہ اسلوب کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی سادہ بیانی ہی میں جادو کا جوہر اور سادگی میں پرکاری ہے، تو شاید غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے ہمیشہ افسانے کے موضوعات کے انتخاب میں سماجی اور ذاتی زندگی کے مسائل کو فوقیت دی ہے۔ اور نہایت جرأت اور ایمانداری سے ان مسائل کو اپنے افسانوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات موجودہ افسانہ نگاروں کے

ہاں کم کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

آخر میں میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ موجودہ دور چترنجن باسو اور خیالورام کا دور ہے۔ اس دور میں کمل کانت جیسے عالم انسان دوست، نیک اور مہذب انسان کے لئے جگہ نہیں ہے۔ مجھے دویجندر ناتھ نرگن کی کہانی 'بغیر اسلوب کی کہانی' شدت سے یاد آرہی ہے۔ اس میں ایک ریٹائر افسر اپنے نیک اور ایماندار دوست سے کہتا ہے کہ 'یہ دنیا اب تمہارے جیسے سادھو لوگوں کے قابل نہیں رہی! یہاں تو میرے جیسے پاپی (گناہ گار) ہی پنپ سکتے ہیں۔"

■❖■

جسم خور کیڑا

''دیکھو نوری ادھر دیکھو یہ ہماری شادی کا البم ہے۔ اس میں نہ صرف میری اور تمہاری شادی کی حسین تصویریں محفوظ ہیں بلکہ میرے اور تمہارے بچپن کی تصویریں بھی اس میں موجود ہیں۔ آج ہماری شادی کی نویں سالگرہ ہے۔ ان نو برسوں میں ہم چار بچوں کے ماں باپ بن چکے ہیں۔ ہم اپنا بچپن اور لڑکپن کہاں چھوڑ آئے ہیں! وقت اپنی رفتار سے گزر رہا ہے اور اس نے ہمیں کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ تمہیں کس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ وقت کے گزران میں میرا اور تمہارا وجود زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے اور ہم کوئی بھی احتجاج نہیں کر پا رہے ہیں۔ اری چپ کیوں ہو کچھ تو بولو کہ یہ وقت ہمیں کہاں لے جا رہا ہے''!

غلام عباس بار بار البم میں سجی اپنی اور بیوی کی خوبصورت تصویروں کو دیکھ کر عمر رفتہ کو آواز دے رہے تھے اور ان کی بیوی نوری قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی پورے جوش وجذبے کے ساتھ اپنی شادی کی نویں سالگرہ منانے کے لئے بناؤ سنگھار کر رہی تھی۔ بنارسی ساڑھی اُس کے خوبصورت سڈول جسم پر سے بار بار پھسلتی جا رہی تھی اور وہ اُس کے سبھی زاویے درست کرنے میں مصروف تھی۔ ساڑھی سے فارغ ہوئی تو ہونٹوں اور آنکھوں کی طرف آئی۔ ہونٹوں پہ کون سی لپ اسٹک لگائے وہ پل بھر کے لئے سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اُس نے ساڑھی کے رنگ پر نظر دوڑائی۔ اس کا رنگ جامنی تھا۔ اس نے اسی رنگ کی لپ اسٹک ہونٹوں پر لگائی۔ آنکھوں میں کاجل لگا ہی رہی تھی کہ غلام عباس موونگ چیئر پر سے اُٹھے، ایک ہاتھ میں البم لئے وہ بیوی کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور اس سے بولے ''دیکھو جاناں!

آخر تم کب تک وقت کے دریا میں یہ بناؤ سنگھار کرتی رہوگی! ادھر دیکھو یہ تمہارے اور میرے بچپن کی تصویریں ہیں۔ ان تصویروں میں کتنی معصومیت ہے۔ ہم اپنے جسمانی خدوخال کو پرکشش بنائے رکھنے کی کتنی فکر اور کوشش کرتے ہیں مگر سب بے سود!''۔

نوری اپنے شریکِ زندگی کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی:

''تمہاری فلسفہ طرازی مجھے کبھی کبھی بہت مایوس کردیتی ہے۔ چھوڑیئے ان باتوں کو مجھے یہ بتایئے کہ میں اس وقت آپ کو کیسی لگ رہی ہوں''۔

''دلہن جیسی دکھائی دے رہی ہو مگر...... میں آگے کیا کہوں''۔

نوری کے لبوں پر مسکان سی بکھر گئی وہ بولی:

''کہیے نا آگے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

غلام عباس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے ''نوری! مجھے وقت کے گزرنے کا احساس اندر ہی اندر نوچتا اور جھنجھوڑتا ہے کبھی کبھی یہ تمنا کرنے لگتا ہوں کہ کاش! وقت کی رفتار تھم جائے اور تغیر نام کی کوئی بھی چیز دنیا میں نہ رہے۔ میں جوان رہوں اور تم بھی جوان رہو! ہم دونوں حسن و عشق کی ڈور میں یوں بندھے رہیں کہ یہ ڈور کبھی ٹوٹنے نہ پائے! مگر یہ سب کچھ چاہتے ہوئے بھی ہم دونوں وقت کے آگے بے بس و مجبور ہیں! کیونکہ وقت جیسے دیوہیکل کے سامنے کوئی بھی نہیں ٹک سکا ہے۔ اس نے آج تک سب کو تہس نہس کردیا ہے۔ یہ بڑی بے دردی سے سب کو روندتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ سچ کہتا ہوں شادی کے موقعے پر تم بہت حسین و جمیل تھیں۔ شادی کے بعد تمہارا حسن ماند پڑ گیا۔ تمہاری لمبی گھنیری زُلفوں میں چاندی جیسی سفیدی اُگ آئی ہے۔ تم اس سفیدی کو سیاہی میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہو مگر وقت صداقت کی لاٹھی سے ہر کھرے کھوٹے کی نشاندہی کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ تمہارے موتی جیسے دانتوں میں نیلا پن در آیا ہے لگتا ہے انہیں اندر ہی اندر کوئی کیڑا برباد کرنے میں لگا ہے۔ تمہارے جسم کی وہ تمام دلکش رعنائیاں اور وہ تمہارا اندازِ دل رُبائی آخر کہاں گیا؟ نوری ہم سب ذمہ داریوں کے بوجھ تلے اس قدر دَب جاتے ہیں کہ ہمیں اپنے آپ کا بھی علم نہیں رہتا۔ وقت نے ہمیں کس مقام پر لا کے کھڑا کیا ہے اور آخرکار ہمارا انجام کیا ہوگا؟ ذرا سوچو تو سہی۔ دیکھو تم میری باتیں سن کر مایوس

ہورہی ہو۔اچھا چھوڑو یہ باتیں یہ بتاؤ میں تمہیں کیسا لگ رہا ہوں؟''نوری نے کہا:

''مجھے تو آپ ایک خزاں رسیدہ پیڑ کی مانند دکھائی دے رہے ہیں یعنی جوانی آپ سے رُخصت ہو چکی ہے اور بڑھاپا آپ کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔آپ کے چہرے پر جھریاں سی اُبھر آئی ہیں اور بالوں میں سفیدی بڑھاپے کا اعلان کر رہی ہے۔آپ کوئی بھی تحریر بغیر عینک کے نہیں پڑھ پاتے ہیں لیکن میرا یہ سناؤ سنگھار پھر بھی آپ ہی کے لئے ہوتا رہے گا۔آپ سدا سلامت رہیں آپ کو ہر وقت خوش دیکھنا چاہتی ہوں''۔

غلام عباس نے کہا:

''نوری! میں واقعی تمہارے بغیر اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا ہوں اور تم بھی میرے بغیر اُدھوری ہو۔ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہ تمہارا میرا ساتھ اور یہ رشتہ آخر کب تک؟ کیونکہ جسم خور کیڑا مسلسل ہمیں کھائے جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا کیڑا ہے جو نظر نہیں آتا، کاش! یہ نظر آتا تو اسے ہم بُری طرح مار دیتے! یہ ہماری زندگی کا ازلی دشمن ہے۔اس نے ہم سے ہمارا بچپن اور لڑکپن بُری طرح چھین لیا ہے اور اب ہماری جوانی ہم سے چھیننے لگا ہے۔ مجھے بڑھاپے سے بہت ڈر لگتا ہے۔نوری! ایک دن آئے گا یہ جسم خور کیڑا ہمارے وجود کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔یقین جانو یہ ہماری تمام جسمانی قوتوں کو چاٹ جائے گا!''۔

نوری نے کہا:

''ابھی میری زندگی کے ارمان باقی ہیں''۔

غلام عباس نے پوچھا''کیا ارمان ہیں تمہارے؟''

''ایک یہ کہ ہمارا ایسا خوب صورت مکان ہو جس کے لان سے مختلف پھولوں کی خوشبو آتی رہے اس کے علاوہ چمچماتی آلٹو گاڑی ہو اور یہ کہ بڑا بیٹا ڈاکٹر بنے،اُس سے چھوٹا انجینئر،تیسرا بیٹا کے۔اے۔ایس آفیسر اور سب سے چھوٹا بیٹا پائلٹ بنے''۔

غلام عباس ہنس پڑے اور کہنے لگے:

''خدا کرے نوری تمہارے یہ ارمان پورے ہوں لیکن یاد رکھو زندگی ایک غیر یقینی سفر ہے۔یہ نہ تم جانتی ہو اور نہ میں جانتا ہوں کہ زمین و آسمان کے صندوق میں ہم کب

تک رہیں گے۔ رہی بات ارمانوں کی تو ارمان اس دُنیا میں کسی کے بھی پورے نہیں ہوتے ہیں۔ انسان کی ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری سر اُبھارنے لگتی ہے اور یہ رشتے ناطے سب جھوٹے ہیں میری نظر میں یہاں سب اپنے مطلب کے یار ہیں"۔

نوری نے پوچھا:

"تو کیا میرا اور آپ کا رشتہ بھی جھوٹا ہے؟"

"ہاں یہ بھی کسی حد تک جھوٹا ہے۔ اس لئے کہ جب میاں بیوی بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔ چاہت کا یہ سلسلہ نفرت میں بدل جاتا ہے اور دونوں کو اپنے ناکارہ وجود سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ قوتِ برداشت ختم ہو جانے کے سبب معمولی معمولی باتوں پر جھگڑنے لگتے ہیں"۔

اچانک غلام عباس کی نظر اپنے کمرے کی کھڑکی سے نیچے قومی شاہراہ پر پڑی تو انہوں نے لالہ مدن گوپال کو اپنی بیوی کملاوتی کے ساتھ ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ دونوں بوڑھے ہانپتے کانپتے گرتے سنبھلتے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ جوانی نے انہیں بڑھاپے کے حوالے کر دیا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں موٹے شیشے کی عینک لگی ہوئی تھی۔ کمر جھکی ہوئی، بال بالکل برف کی مانند سفید ہو چکے تھے۔ دونوں بڑھاپے کی ڈراونی صورتیں لئے آہستہ آہستہ سڑک پر چل رہے تھے۔ غلام عباس نے کہا:

"نوری میرے قریب آؤ وہ دیکھو"۔

"کیا ہے؟" نوری نے پوچھا۔

غلام عباس نے کہا:

"وہ دیکھو ہمارے شہر کا امیر ترین آدمی لالہ مدن گوپال آج کس بے سروسامانی کے عالم میں ہیں۔ یہ وہی مدن گوپال ہیں جو کئی فیکٹریوں، کارخانوں اور گاڑیوں کے مالک تھے لیکن آج جسم خور کیڑے نے ان کا کیا حال بنا رکھا ہے! میں لالہ مدن گوپال کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ وہ کئی بار مجھے اپنی رودادِ غم سنا چکے ہیں۔ اپنے تین بیٹوں کے روشن مستقبل کے لئے انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا ہے لیکن آج ان کے پتھر دل بیٹے اپنی بیویوں کے بہکاوے میں آکر اپنے بوڑھے والدین کو ایک بھاری بوجھ سمجھ کر انہیں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔

نوری نے غلام عباس سے پوچھا۔

''اس بوڑھے آدمی کے ساتھ یہ بوڑی ضعیف عورت کون ہے؟''

غلام عباس نے کہا:

''یہ کملاوتی ہے، لالہ مدن گوپال کی بیوی۔ یہ ایک زمانے میں انتہائی حسین عورت تھی اور مدن گوپال خود بھی بہت خوبصورت اور فولادی وجود کے حامل تھے، لیکن وقت کے دریا میں بہتے بہتے یہ دونوں میاں بیوی آج اس حال میں پہنچ چکے ہیں۔ آج یہ بے سہارا اور محتاج ہیں''۔

نوری نے حیران ہو کر غلام عباس سے پوچھا:

''تین بیٹے ہونے کے باوجود اتنے بڑے امیر ترین میاں بیوی کا یہ حال! ایسا کیوں ہے؟''۔

سنو نوری لالہ مدن گوپال نے ایک دن مجھے اپنی دُکھ بھری کہانی سنائی تھی۔ کہنے لگے:

''بیٹا میرے تین بیٹے ہیں۔ بیٹی کوئی نہیں ہے، تینوں کو بڑے ناز و نعم میں پڑھایا لکھایا۔ بڑا بیٹا فوج میں برگیڈیئر ہے۔ دوسرا تحصیلدار ہے اور تیسرا آپ کے شہر کا سب سے بڑا بزنس مین ہے۔ بڑے بیٹے کی شادی کی کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی بیوی کے ہمراہ مدراس چلا گیا۔ اُس کے بعد دوسرے بیٹے کی شادی کی تو وہ بھی ہم سے الگ ہو گیا اور جب تیسرے بیٹے کی شادی کی تو وہ تین سال تک ہمارے ساتھ رہا۔ اس کے دو بچے ہونے کے بعد وہ اور اس کی بیوی ہم سے نفرت کرنے لگے۔ محض اس بات پر کہ مجھے رات کو کھانسی آتی تھی اور میری کھانسی کی وجہ سے ان کے بچوں کی نیند میں خلل پڑتا تھا چنانچہ تین سال کے بعد وہ بھی ہم سے الگ ہو گیا۔ میری کروڑوں روپے کی پراپرٹی پر جب میرے بیٹے لڑنے جھگڑنے لگے تو میں نے سب کچھ ان میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے میری ہر چیز کو سنبھال لیا لیکن ہم بوڑھوں کو انہوں نے نہیں سنبھالا! وہ ہمیں تقسیم نہیں کر سکے۔ بیٹے ہم تو چتا تک ایک دوسرے کے ساتھ جائیں گے۔ میری بوڑھی کملاوتی بڑی مشکل سے میرے اور اپنے لئے دو وقت کا کھانا تیار کر لیتی ہے لیکن بیٹا اب شاید ہم دونوں بہت جلد ''وردھ آشرم'' میں داخلہ لیں گے کم از کم زندگی کے کچھ دن کسی کی دیکھ بھال میں تو گزر جائیں!۔ آخری جملہ کہتے

ہوئے لالہ مدن گوپال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے نوری!"۔

نوری نے بڑے افسردہ لہجے میں غلام عباس سے پوچھا:

"تو کیا ہم بھی بوڑھے ہو جائیں گے؟ کیا بڑھاپے میں اولاد ماں باپ سے نفرت کرنے لگتی ہے اور کیا یہی عمر دھکے کھانے کی ہوتی ہے؟"

"ہاں نوری! ایک وقت آئے گا ہم بوڑھے ہو جائیں گے اتنا ہی نہیں بلکہ جسم خور کیڑا ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بوڑھوں سے ہر کوئی نفرت کرتا ہے"۔

یہ باتیں سن کر نوری نے جھٹ سے غلام عباس کا ہاتھ اپنی مٹھی میں لے کر زور سے بھینچا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑی۔ وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی:

"جدائی کی بات نہ کرو بالم میرا دل گھبراتا ہے"۔

غلام عباس نے کہا:

"نوری مجھے قبر کی تاریکی یاد آتی ہے تو ڈر جاتا ہوں!"

سورج غروب ہو رہا تھا اور دور کہیں ریڈیو پہ یہ گانا بج رہا تھا!

کبھی تیرا دامن نہ چھوڑیں گے ہم
چاہے زمانہ کرے لاکھوں ستم
ہائے کبھی تیرا دامن ....

■❖■

سرگوشی

وہ دونوں اپنے محلے میں خوشحال اور گوپال کے نام سے جانے جاتے تھے۔ بچپن سے دونوں نہایت شرارتی، کام چور اور بہت حد تک مُفسد تھے۔قد اور عمروں میں کوئی بھی تفاوت نہ تھا۔ایک محلے کے کتے کو دوسرے محلے کے کتے سے لڑاتے یا کلغی دار مرغوں کو پکڑ کر انہیں ایک دوسرے کے قریب رکھتے۔مرغے آپس میں اُچھل اُچھل کر ٹھونگیں مارتے مارتے جب لہولہان ہوجاتے تو یہ دونوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتے۔انہیں اس طرح کے یہ خونی کھیل پسند تھے۔والدین نے بڑے شوق سے ان کو اسکول میں داخل کروایا تھا۔اس امید کے ساتھ کہ یہ پڑھ لکھ کر نہ صرف اپنے والدین اور خاندان کا نام روشن کریں گے بلکہ پورے علاقے کو وقار بخشیں گے،لیکن اپنی شرارتی ذہنیت کے باعث یہ دونوں دسویں سے آگے نہیں جاسکے تھے۔استادوں،والدین اور خاندان کے بزرگوں کی لعن طعن اور ڈانٹ ڈپٹ کا اُن پہ کوئی بھی اثر نہیں ہوتا تھا،نہ معلوم کس مٹی سے ان کا خمیر تیار ہوا تھا۔اب یہ جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ چکے تھے لیکن اس کے باوجود سنجیدگی نام کی کوئی بھی چیز ان میں نہیں آئی تھی۔کبھی ان کے والدین یہ چاہتے کہ دونوں کی شادی کردیں تا کہ ان کی خرمستی سنجیدگی میں بدل جائے مگر یہ خیال آتے ہی وہ دل مسوس کے رہ جاتے کہ ایسے نکمے اور اوباش قسم کے لڑکوں کی شادی کرانا کسی کی بیٹیوں کو سولی پہ چڑھانے کے مترادف ہے!!

آج اتوار تھا،وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہنستے مسکراتے ایک وسیع وعریض اور دلکش پارک میں پہنچ چکے تھے۔تقریباً ہر عمر کے مرد وعورتیں چنبیلی،نرگس، جنگلی موتیا،چھوئی موئی،گیندے،رات کی رانی اور سرخ وسفید گلاب کے پھولوں کی بھینی بھینی

خوشبو سے اپنے دماغوں کو معطر کر رہے تھے۔ پوری پارک میں کل آٹھ چنار کے پیڑ ترتیب وار نصب تھے جن کی گھنی چھاؤں میں ہر شخص تازگی اور راحت محسوس کرتا۔ ان کے علاوہ دیودار اور مور پنکھ کے چھوٹے چھوٹے پیڑ پارک کی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ سیر و تفریح کرنے والوں کو اپنی طرف راغب کر رہے تھے۔ پوری پارک میں چاروں جانب پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ لوہے کے خوشنما بینچ لگے ہوئے تھے۔ محمد خوشحال اور گوپال دت دونوں دوست ایک بینچ پہ بیٹھ گئے۔ چند ہی لمحوں بعد ایک غیر شادی شدہ جوڑا اُن کے سامنے دور ایک بینچ پہ بیٹھ گیا۔ لڑکی نہایت خوبصورت اور دلکش اداؤں کے ساتھ جھومتی مسکراتی اپنی پسند کے لڑکے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ لڑکا بھی قد آور اور پُر رونق چہرے مہرے والا تھا۔ دونوں کے دلوں میں نہ جانے کب سے ایک دوسرے کے تئیں پریم رس کی دھارا نے ہلچل سی مچادی تھی۔ لڑکے نے اپنی جیب سے نہایت خوبصورت اور قیمتی موبائل سیٹ نکالا، اپنی مخروطی انگلی سے اسے ایک دو بار چھوا اور موبائل میں یہ نغمہ گونج اٹھا:

دنیا والوں سے دور جلنے والوں سے دور
آجا آجا چلیں کہیں دور کہیں دور کہیں دُور

لڑکی نغمے کی دُھن پر سر دُھننے لگی اور پھر بے ساختہ لڑکے کی آغوش میں اپنا سر رکھ دیا۔ لڑکا اس کی زلفوں کو ہاتھ سے سنوارنے لگا۔ دونوں محبت اور چاہت کے نشے میں مخمور دنیا و مافیہا کو بھول بیٹھے تھے۔ محمد خوشحال اور گوپال دت ان دونوں پیار کرنے والوں کو حسد و رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب نظارہ کچھ زیادہ ہی دلچسپ اور رنگین ہو گیا تو محمد خوشحال نے گوپال دت کو کہنی سے ہلکورہ مارتے ہوئے کہا:

''یار گوپال! میں یقین سے کہتا ہوں کہ ان دو پیار کرنے والوں کو دنیا کی کوئی بھی طاقت جدا نہیں کر سکتی ہے''۔

گوپال دت نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''ارے یار کیا بات کر رہا ہے تو، یہ کام تو میں دو منٹ میں کر سکتا ہوں''۔

محمد خوشحال نے متعجب انداز میں پوچھا۔

''میرے دوست! وہ کیسے؟ میری نظر میں تو یہ ناممکن ہے''۔

گوپال دت نے کہا۔
''میرے دوست تُو دیکھ میں کیا کرتا ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس غیر شادی شدہ جوڑے کے بالکل قریب پہنچ گیا، یہ دونوں اسے اپنے قریب آتے دیکھ چونکے اور پھر تھوڑا سنبھل کے بیٹھ گئے۔ گوپال دت نے بڑے ادب اور انکساری سے کہا۔
''بھائی صاحب! میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اس لئے لمحہ بھر کے لئے میری بات سن لیجئے''۔
عاشق مزاج نوجوان نے کہا۔
''جی کہئے''۔ اور فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، لڑکی ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے دماغ میں حیرت کی بجلی کوندنے لگی۔ گوپال دت نے اس خوبصورت نوجوان کو چند گز کے فاصلے پر ایک طرف لیا اور اس کے کان میں بالکل آہستہ سے کہا۔
''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں''۔ اس جوان نے کہا'' کہئے نا''۔
گوپال دت نے ہنستے ہوئے کہا'' اچھا اب نہیں کہوں گا''۔ بس اتنی سی بات کہہ کے گوپال دت واپس اپنے دوست محمد خوشحال کے پاس آیا اور اسے کہا۔
''اب تماشہ دیکھنے کے لئے تیار ہو جا، مگر یہاں پہ بیٹھنا اب ہمارے لئے مناسب نہیں، چلو دور سے ان کا تماشہ دیکھتے ہیں''۔
عاشق مزاج نوجوان کو دل ہی دل میں گوپال دت پہ غصہ آ رہا تھا، وہ جب اپنی محبوبہ کے پاس پہنچا تو محبوبہ نے بڑے مضطرب لہجے میں اپنے عاشق سے پوچھا۔
''یہ اجنبی شخص آپ کو کیا کہہ رہا تھا؟''۔
''اری یہ کوئی پاگل لگتا ہے، اس نے تو مجھے کوئی بھی بات نہیں سنائی''۔
لڑکی کا لہجہ فوراً تلخ ہو گیا وہ بولی'' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی آپ کو میری نظروں کے سامنے مجھ سے الگ لے جا کر ایک ضروری بات سنا رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ تو آپ مجھ سے سراسر جھوٹ کہہ رہے ہیں''۔
لڑکے نے یقین دلاتے ہوئے کہا'' میں سچ کہہ رہا ہوں اُس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا''۔

لڑکی کے دل و دماغ میں شک کی سوئی گھومنا شروع ہوگئی اس نے کہا۔

’’میں پوچھ رہی ہوں وہ کیا کہہ رہا تھا؟ آخر مجھ سے آج آپ یہ بات کیوں چھپا رہے ہیں‘‘۔

لڑکے نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔

’’میں کہہ رہا ہوں اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا...... کچھ نہیں کہا...... کچھ نہیں کہا ...... تمہیں مجھ پہ یقین نہیں رہا؟‘‘

لڑکی نے بھی غصے میں کہہ دیا۔

’’ہاں مجھے تم پہ یقین نہیں رہا۔ نو مہینے میں، میں نے تم سے اپنے جسم و جان و دل کی کوئی بھی چیز اور بات نہیں چھپائی لیکن آج تمہاری اصلیت میرے سامنے آگئی، بس میری نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جاؤ‘‘۔ لڑکی نے غصے کی حالت میں ایک دم اپنے پرس سے اپنے عاشق کا فوٹو نکالا اور اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اس کی طرف پھینک دیا۔

لڑکے نے جب اپنی تذلیل کا یہ بھیانک رُخ دیکھا تو اس نے بھی کہہ دیا۔

’’تُو کسی ذلیل اور کمینے خاندان کی ہے، یہ مجھے آج معلوم ہوا‘‘۔

لڑکی نے جب یہ سنا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی، اس نے فوراً اپنی اونچی ہیل والی چپل پاؤں سے نکالی اور للکارتی ہوئی بولی

’’میرے خاندان کی بات نہ کرنا ورنہ اس سے تیرا سر گنجا کر دوں گی‘‘۔ ان دونوں کی تکرار دیکھ کر لوگ ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔ لڑکے نے چاہا کہ وہ گوپال دت کو پکڑے اور اس کا سر قلم کر دے، اس نے چاروں جانب نظریں دوڑائیں لیکن گوپال دت اور محمد خوشحال دونوں مُفسد روپوش ہو چکے تھے۔

■❖■

باغی

اس کا نام جیون داس تھا، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، بے حد ذہین اور خوبصورت تھا۔ آٹھویں جماعت ہی سے کئی شوخ و چنچل قسم کی حسینائیں اس پہ فدا تھیں مگر وہ بھی بڑے کٹھور دل کا تھا۔ اس نے نامعلوم یہ راز کیسے جان لیا تھا کہ ایک طالب علم کا کسی حسینہ سے عشق کرنا اس کی بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے اپنا تعلیمی سفر پھونک پھونک کر طے کیا تھا۔ مگر بالآخر جب وہ کمیسٹری میں ایم ایس سی کر رہا تھا تو کومل نام کی لڑکی نے اپنے حسن اور عشق کی تپش سے اسے موم بنا دیا تھا۔ وہ خود تو برہمن زادہ تھا اور کومل رام داسی تھی لیکن محبت، ذات پات، اونچ نیچ، دین دھرم اور امیری غریبی نہیں دیکھتی۔ دونوں کے دلوں میں محبت کی چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بنا اداس رہتے تھے، پھر ایک دن انہوں نے تمام خاندانی اور سماجی بندھنوں، رسموں، رواجوں اور عقیدوں کی پرواہ کئے بغیر کورٹ میرج کر لی۔ کومل کے ماں باپ نے اس کے اس جرأت مندانہ اقدام پر کوئی خاص ناراضگی ظاہر نہیں کی کیونکہ وہ کسی حد تک اس بات پر فخر محسوس کر رہے تھے کہ ان کی بیٹی ایک برہمن زادے کو اپنا عاشق بنانے میں کامیاب ہوئی ہے مگر جیون داس کے والدین نے جب اپنے بیٹے کا یہ انوکھا کارنامہ سنا تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے ان کے چہروں پر کالک پوت دی ہو۔ ہر ماں باپ کی تمنا ہوتی ہے کہ ان کے بیٹے یا بیٹی کی برات سجے، ڈولی اٹھے اور اپنے پرائے سبھی شادی جیسے پر مسرت موقع پر مدعو کئے جائیں، گیت گائے جائیں اور جشن منایا جائے۔ جیون داس کے والدین نے بھی دل ہی دل میں اس کی شادی کے کئی ارمان پال رکھے تھے۔ مگر اس نے ان کی تمناؤں کا کوئی بھی خیال نہ

رکھتے ہوئے کومل جیسی نیچ ذات کی حسین وجمیل اور سلیقہ شعار لڑکی کو اپنی بیوی بنالیا۔ دراصل جیون داس بچپن ہی سے آزاد خیال اور باغیانہ طبیعت کا حامل تھا۔ وہ کرم دھرم اور ذات پات پہ بالکل یقین نہیں رکھتا تھا۔ جب وہ سماج میں ذات پات میں بٹے لوگوں کو دیکھتا یا مذہب اور دھرم کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم اور تصادم دیکھتا تو اس کا دل اندر ہی اندر چھلنی ہوجاتا اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا کہ نسل آدم اعضائے بدنی کے اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہوتی ہے دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک ایک منہ، ایک زبان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں، دو پاؤں اور خون میں بھی کوئی فرق نہیں بالکل سرخ رنگ کا تو پھر یہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بدھ اور جین کے علاوہ بے شمار ذاتوں اور عقیدوں میں بٹا یہ انسان آخر کیوں؟

الیکشن کے دوران جب نیتا لوگ سفید لباس میں ملبوس اپنا ووٹ بینک بنانے کی خاطر دھرم اور مذہب کی آڑ لے کر عوام کے جذبات واحساسات سے کھیلتے اور اس طرح لی تقریریں کرتے۔

> ”میرے دیش واسیو! اپنے اندر جاگرتی پیدا کرو، ہندو دھرم خطرے میں ہے، ہندو وہی ہے جو اپنے دھرم اور دیش کی رکھشا کرے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے ہو کہ بھارت میں رام راجیہ قائم کیا جائے۔“

دوسرا نیتا مسلمانوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے اس طرح کی زہر افشانی کرتا:

> ”میرے مسلم بھائیو اور بہنو! اسلام خطرے میں ہے اور تم غفلت کی نیند میں سوئے پڑے ہو۔ کل خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے، ہم مسلمان ہوتے ہیں اور تمہیں پتا ہی نہیں کہ مسلمانوں کے کیا کام ہوتے ہیں۔ اب کی بار مجھے کامیاب کراؤ گے تو اسلام گھر گھر میں داخل کراؤں گا، امن وچین کی زندگی جیو گے۔“

سیاسی نیتاؤں کی یہ اشتعال انگیز تقریریں سنتے وقت جیون داس کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے کسی خاص جرم کی پاداش میں ایذارساں آدمی اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال رہا ہو۔ کبھی کبھی وہ کافی جذباتی ہوجاتا، تب اس کا جی چاہتا کہ وہ سب کو للکار کر کہے کہ چھوڑ دو یہ دھرم، مذہب، ریتی رواج، ذات پات، فرقہ پرستی اور چھوت چھات کے تمام

ڈھونگ اپنے اپنے خول سے باہر نکل آؤ، دھرم مذہب ذات پات سے اوپر اٹھ کر انسانیت کے پلیٹ فارم پر جمع ہو جاؤ، چھوٹی ہی عمر سے اس کے دل میں یہ لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا اور آج اس نے کومل جیسی نیچ ذات کی لڑکی سے شادی کر کے ذات پات، چھوت چھات اور اونچ نیچ کی تمام دیواریں توڑ دی تھیں۔ وہ آج اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ کیمسٹری میں ایم ایس سی ہونے کی حیثیت سے وہ ہر چیز کو سائنٹیفک طریقے پر جانچنے پرکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ سماجی بندشوں، رسموں، رواجوں اور دین دھرم کی صداقت سائنٹیفک طریقے پر معلوم کرے مگر اسے اپنے تمام تجربات و مشاہدات سے یہ سب انسان کی انانیت، غریبوں کا استحصال اور توہم پرستی کی بھیانک صورتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ مغربی فلسفہ اور سائنسدانوں کے کارناموں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ سقراط، افلاطون، ارسطو، کارل مارکس، فرائڈ، ڈارون، یونگ، نطشے، جان اسٹارٹ مل کے علاوہ گلیلیو، کوپرنیکس، نیوٹن، گراہم بیل، رائٹ برادرس، مارکونی، تھامس ایڈیسن، اور چارلس ببیج کے کارناموں سے بے حد متاثر تھا۔ اس لئے وہ ہر چیز کو سائنسی نقطہ نظر سے دیکھنے کا قائل تھا۔ سائنس اس کے دماغ میں اس حد تک گھس گئی تھی کہ وہ تمام سماجی، اخلاقی، روحانی اور مذہبی اقدار کو انسان کی خودغرضی سے تعبیر کرتا تھا۔

کورٹ میرج کے فوراً بعد جیون داس اور کومل ہنی مون منانے مسوری اور نینی تال چلے گئے۔ دس دن کے بعد جب جیون داس اپنی شریک زندگی کے ساتھ اپنے والدین کے لئے بہت سے تحفے لے کر گھر پہنچا تو اس کی ماں گھر کے آنگن میں بیٹھی اپنی قسمت کا رونا رو رہی تھی اور اس کا باپ واسدیو ایک کمرے میں بستر پر لیٹا اس گھڑی پر کف افسوس مل رہا تھا کہ جب اس نے جیون داس کو اسکول میں داخل کروایا تھا۔ غم و غصے سے اس کا دماغ ابل رہا تھا۔ جیون داس مسکراتے ہوئے ماں کی طرف بڑھا تا کہ اس کے چرن چھوئے اور آداب بجا لائے۔ مگر ماں اسے دیکھتے ہی ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دور ہٹ گئی اور بولی ’’مجھ سے دور ہو جا تو میرا بیٹا نہیں ہے تو نے پورے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی ہے۔ میرا دھرم بھرشٹ کرے گا۔ نکل جا یہاں سے اور اس چمارن کو بھی میری نظروں سے دور لے جا۔‘‘

ماں کی اس حقارت آمیز رویے پر جیون داس اور اس کی بیوی کومل بالکل ناراض نہیں ہوئے بلکہ دونوں زور سے ہنس پڑے جیون داس نے کہا۔

''ماں جی! آپ بلاوجہ ناراض ہورہی ہیں۔ اپنی مرضی سے شادی کرنا میرا حق تھا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ہم سب انسان ہیں، ہم پڑھے لکھے لوگ چھوت چھات اور ذات پات پہ یقین نہیں رکھتے'' پھر اس نے کومل سے کہا:

''کومل جاؤ! میری ماں کا منہ میٹھا کراؤ۔''

کومل نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا اور ایک پیس ہاتھ میں اٹھا کر اپنی ساس کی طرف بڑھی۔ پتلون اور جیکٹ میں اس کا سڈول جسم کچھ زیادہ ہی دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ مگر جیون داس کی ماں دیر تک اسے دھتکارتی ہوئی ''دور ہٹ دور ہٹ'' کہتی رہی اور کومل بھی اس کے پیچھے ہنستی مسکراتی دوڑتی رہی۔ دیر تک ساس بہو کی آنکھ مچولی پر جیون داس ہنستا رہا اور پھر دونوں نے زبردستی ماں کو پکڑ کر مٹھائی کھلا دی لیکن وہ تھوتھو کرتی رہی۔ جیون داس نے اسے منانے کے لئے دوسرا حربہ استعمال کیا اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''ماں جی میں آپ کا بیٹا ہوں بھگوان کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔

میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں مجھے غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔''

پھر اس نے ماں کے پاؤں پکڑ کر اپنا چہرہ ان پہ رکھ دیا تو ماں کا دل پسیج گیا۔ وہ رو اٹھی، اس کے بہتے آنسو دیکھ کر جیون داس بھی رو پڑا۔ یہ سب منظر دیکھ کر کومل کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے۔ پھر معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسی دوران جیون داس کا باپ واسدیو اپنے کمرے سے باہر نکلا اور اپنے بیٹے کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ باپ کا ناخوشگوار رویہ دیکھ کر جیون داس کچھ دکھی سا ہو گیا۔ اپنے دکھ سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے رات کو تھوڑی سی وہسکی پی اور سو گیا۔ واسدیو نے بیوی کو بڑے غصے سے پوچھا:

''تم نے اس شودر کو کیوں گھر میں داخل ہونے دیا۔ اسے بول کہ گھر چھوڑ کر کہیں دور چلا جاتا کہ میری نظریں اسے کبھی دیکھ نہ پائیں۔''

جیون داس کی ماں خاموش رہی۔ وہ کیا کہتی وہ خود اندر ہی اندر ٹوٹ گئی تھی اور

بھگوان سے اپنی موت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ جیون داس ماں باپ کی ناراضگی اوران کی محدودسوچ پر کافی دُکھی تھا۔ وہ سوچ کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا یہ چاہ رہا تھا کہ تمام ملک کے لوگوں میں ایکتا، بھائی چارے اور خوشحالی کی لہر دوڑ جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ تمام لوگ مذہبوں، دھرموں، ذات پات، چھوت چھات اور ریتی رواجوں کو چھوڑ کر انسانیت کے رنگ میں رنگ جائیں کیونکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دنیا میں انسان کا خون سب سے زیادہ مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر بہایا گیا ہے۔ ایک ہفتے تک جیون داس مسلسل بیقراری محسوس کرتا رہا۔ وہ لاکھوں لوگوں تک اپنے باغیانہ خیالات ونظریات پہنچانے کا کوئی بہتر موقع تلاش کر رہا تھا کہ جہاں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی تعداد لاکھوں میں ہوتی۔ معاً اس کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے مسرت آمیز لہجے میں بیوی سے کہا۔

''کومل! ساون کی ۲۱ تاریخ کو ہم 'ملن میلے' میں جائیں گے۔ اس میلے میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی بھاری تعداد ہوتی ہے۔

کومل نے پوچھا 'یہ میلہ کس خوشی میں منایا جاتا ہے۔''

جیون داس نے جواب دیا۔

''یہ میلہ تین طرح کے عاشقوں کا میلہ ہوتا ہے ایک وہ جن کی نئی نئی شادی ہوئی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہوتی ہے اور تیسرے وہ جو اپنے بہار شباب کے دنوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔''

ساون کی ۲۱ تاریخ کو جیون داس اپنی جیون ساتھی کومل کے ساتھ ملن میلے میں چلا گیا۔ میلے میں لاکھوں لوگ موجود تھے عورتیں، مرد، بوڑھے نوجوان اور بچے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ سبھی آج ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے مذہبوں، دھرموں، عقیدوں، ذاتوں اور رسموں کو اپنے اپنے گھروں ہی میں چھوڑ آئے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی جن کے چہرے خوشی سے کھل رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اس احساس کی غمازی کر رہے ہوں کہ کب کے بچھڑے کہاں آ کے ملے۔

جیون داس نے بیوی سے کہا:

کومل! آج میں ان لاکھوں لوگوں تک اپنے ترقی پسند خیالات ونظریات پہنچانا چاہتا ہوں۔تم یہ تو جانتی ہو کہ ہمارے ملک میں بسنے والے لوگ مختلف ذاتوں، مذہبوں اور ریتی رواجوں اور مخالف مذہبی نظریات کی بنیاد پر انسانیت کا خون بہاتے ہیں۔اس لئے آج میں ان کو ایک بہت بڑی بات سناؤں گا تا کہ یہ امن وسلامتی اور ترقی کی زندگی بسر کریں۔''

کومل نے کہا:

''خاموش رہیئے ہم یہاں ملن میلہ دیکھنے آئے ہیں۔''

''نہیں کومل! مجھے آج اپنے دل کی بھڑاس نکالنے دو۔ میں عوام کو ایک نیا راستہ دکھانا چاہتا ہوں اور اپنے علم کی روشنی سے ان کی زندگی کی تاریک راہوں کو منور کرنا چاہتا ہوں۔''

جیون داس نے کومل کے منع کرنے کے باوجود لاؤڈ اسپیکر پر تمام لوگوں کو باآواز بلند مخاطب کیا:

''میرے دیش کے لوگو! میرے قریب آؤ، میری بڑی بات سنو میں آج آپ کو انسانیت اور بھائی چارے کا ایک نیا فارمولہ بتانا چاہتا ہوں۔ ہمارا ملک اس فارمولے کے تحت ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا اور ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں جو اکثر خوں ریزیاں ہوتی ہیں وہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گی۔''

جیون داس کی لوگ اُس زوردار آواز ہر ایک کے کان میں پڑی اور تمام فرقوں کے لوگ اس کے قریب آنا شروع ہو گئے۔سب میں ایک تجسس پیدا ہوا کہ آخر جیون داس آدمیوں کے اس وسیع وعریض جنگل میں کیا پیغام مسرت سنانا چاہتا ہے۔سب کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں سب کو انتظار اس بات کا تھا کہ آخر جیون داس کہنا کیا چاہتا ہے۔

تھوڑے وقت کے بعد جیون داس نے کہنا شروع کیا۔

''میرے دیش میں بسنے والے بھائیو، بہنو اور بزرگو! ہم سب انسان ہیں مگر مختلف فرقوں، ذاتوں اور رسموں رواجوں میں بٹے ہوئے ہیں۔کوئی اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے کوئی مسلمان، کوئی سکھ، کوئی بدھ

اور کوئی جین کہتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت ساری ذاتوں میں ہم بالکل سمٹ کے رہ گئے ہیں۔ ان مذہبوں، دھرموں اور ذاتوں کی بنیاد پر ہم ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم کرتے ہیں۔ ہم نے ان چیزوں کو اتنی ہمیت دے رکھی ہے کہ ہمارا ملک ترقی کے بدلے انتہائی تنزلی کا شکار ہو کے رہ گیا ہے۔ اس لئے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں امن وامان اور خوشحالی قائم ہو، ہمارا ملک ہر طرح سے ترقی کرے اور ہمیں صحیح زندگی کا لطف حاصل ہو تو اس کے لئے آپ میری باتوں پہ عمل کیجئے میری رائے یہ ہے کہ آپ تمام .... مذہبوں، ذاتوں اور رسموں ورواجوں سے اپنا دامن حیات چھڑا لیجئے۔ آپ کا کوئی بھی دین دھرم نہ ہو نہ کوئی ذات ہو بلکہ آپ صرف انسان بن کے رہیں کوئی بھی مذہبی پابندی نہ ہو، کیونکہ مذہبی جنون ہماری تمام آزادیاں اور عیاشیاں ختم کر دیتا ہے۔''

مسلسل بولتے بولتے جب جیون داس کی زبان بالکل خشک ہوگئی تو اس نے پانی کا گلاس منگوایا اور کھڑے کھڑے غٹ غٹ کر کے پی لیا۔ رتن لعل جو حالیہ اسمبلی انتخاب میں ہار گیا تھا اس نے اپنے نزدیک بیٹھے ایک شخص سے آہستہ سے کہا۔

''لگتا ہے سالہ پکا ناستک ہے ہم تو مذہب ہی کے نام پر لوگوں سے ووٹ حاصل کرتے ہیں اور یہ کہتا ہے دین دھرم ہی چھوڑ دو۔''

جیون داس نے پھر بولنا شروع کیا۔

''میرے دیش کے لوگو! انگریزوں کو دیکھو وہ کس طرح پوری دنیا پر حکومت کر رہے ہیں اور خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی ترقی اور کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ دین دھرم اور ذات پات پر یقین نہیں رکھتے اور نہ ہی ان میں حرام حلال کی تمیز ہوتی ہے۔ وہ تو کیڑے مکوڑے، جانور یہاں تک کہ سانپ کو بھی مچھلی کی طرح روسٹ کر کے کھا لیتے ہیں۔ اور پھر ہم ہندوستانیوں کا اپنا کیا ہے؟ ہم نے کونسی ایجادات کی ہیں۔ ہم تو

انگریزوں کے نقال ہیں۔ یہ ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن، بجلی، ریل گاڑی، موبائل فون اور کمپیوٹر یہاں تک کہ یہ جو تمہاری اور میری پینٹ اور اس کی زیب ہے یہ بھی انگریزوں ہی نے بنائی ہے ورنہ اس سے پہلے تو ہمارے یہاں لنگوٹ ہی پہنا کرتے تھے۔ یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہم اپنے بچّوں کو چھوٹی ہی عمر میں ہندو، مسلمان اور سکھ بننے کی تربیت دیتے ہیں۔ گویا ہم انہیں انسان بنانے کی بجائے ہندو، مسلمان اور سکھ بنانا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بچے کو اسکول میں داخل کرنے کے لئے ایک متعینہ عمر رکھی گئی ہے۔ ووٹ ڈالنے اور شادی کرنے کے لئے عمریں مقرر ہیں۔ لیکن بچے کو ہم اسی وقت سے ہندو، مسلمان اور سکھ بنانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں جب وہ بالکل نابالغ ہوتا ہے۔

جیون داس لمحہ بھر کے لئے خاموش ہو گیا تو کمال دین نے اپنے قریب بیٹھے شخص سے آہستہ سے کہا ''لگتا ہے یہ انگریزوں کا ایجنٹ ہے۔''

جیون داس نے اپنے باغیانہ خیالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا ''میرے دیش کے لوگو! آخر تم کب تک ان رسموں، رواجوں اور عقیدوں کے لئے اپنی ترقی اور خوشحالی کے راستے مسدود کرتے رہوگے؟ اس لئے میرا آپ کو یہی مشورہ ہے کہ انگریزوں کا طرز زندگی اپنالو اور خوشحال زندگی جیو کیونکہ انگریزوں کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ تمہاری طرح رسموں رواجوں کی پرواہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آزاد اور ترقی یافتہ ہیں۔''

نریندر سنگھ نے اپنی پگڑی درست کرتے ہوئے آہستہ سے اپنے قریب بیٹھے ایک شخص سے کہا ''لگتا ہے کہ اس سالے کا دماغ خراب ہو گیا ہے تبھی یہ ایسی باتیں کرتا ہے۔'' جیون داس کا بھاشن سنتے سنتے جب ہندو، مسلمان اور سکھ فرقے کے لوگ تھک گئے تو انہوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لینا شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں لوگوں کا مجمع غائب ہو گیا۔ کسی میں بھی جیون داس کے باغیانہ خیالات کا منہ توڑ جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان کی خاموشی جیسے یہ ظاہر کر رہی تھی کہ انہیں جیون داس کے تمام باغیانہ نظریات سے کوئی بھی اختلاف نہیں ہے۔

جیون داس نے جب دیکھا کہ تمام فرقوں کے لوگ بغیر کسی احتجاج کے اپنے

اپنے گھروں کی طرف جارہے ہیں تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر میں پنجابی گانے کی کیسٹ فٹ کی اور دور دور تک لاؤڈ اسپیکر پر اس گانے کی آواز گونجنے لگی:

''کھاؤ پیو عیش کرو مترو دل پر کسے دا دکھائیو نئیں''

اب جیون داس اس گانے کی دھن پر چند نوجوانوں کے ساتھ ناچ رہا تھا اور کچھ ہی لمحوں بعد اس کی بیوی کومل بھی ناچنے لگی۔

فتنہ

مولوی نعیم الدین تین سال سے چوراہے والی مسجد کے امام تھے۔ عمر اٹھائیس سال کی رہی ہوگی۔ جوانی کا جوبن ان پر سوار تھا۔ گورے چہرے پہ سیاہ مٹھی بھر داڑھی، سفید کرتہ، پائجامہ اور اوپر سے کالی واسکٹ پہنے، گلے میں سفید اور لال رنگ کی دھاریوں والا ململ کا بڑا رومال، چال ڈھال میں ایک خاص قسم کا طمطراق یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ شرافت اور وضعدار شخصیت کے مالک ہیں۔ حال ہی میں مولویت اور علم قرأت کی سند حاصل کی تھی۔ بہترین مقرر بھی تھے۔ ابھی کنوارے تھے۔ جسم تو جوان تھا ہی دل بھی جوان تھا۔ اسی لئے کبھی کبھی ان کے دل کا پرندہ کالی پہاڑیوں کی طرف اڑان بھرنے کو مچلتا مگر فوراً ان کے دل ودماغ میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی عظمت اور قبر کی تاریکی میں گناہوں کی سزا کا خیال پیدا ہوتا تو ان کے دل کا پرندہ پھڑ پھڑا کے رہ جاتا۔ چار منزلہ چوراہے والی مسجد شہر کے وسط میں اپنی ایک الگ نوعیت کی مسجد تھی۔ مسجد کا گنبد اور اس کے مینار انتہائی دلکش تھے۔ چاروں طرف لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے۔ اعلان حق کی صدائیں پانچوں وقت دور دور تک گونجتی تھیں۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ نمازی جوق در جوق مسجد کی طرف آرہے تھے۔ مسجد کی پہلی منزل تقریباً بھر گئی تھی اور لوگ اب دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگے تھے کہ مولوی نعیم الدین صفیں پھلانگتے ہوئے منبر پر مائک لے کر چڑھ بیٹھے۔ انہوں نے پہلے تو چند قرآنی آیات تلاوت فرمائیں اور اس کے بعد آثار قیامت کی طرف آئے۔ ان کے پر جوش لب ولہجے میں طنز و رمز کے نشتر شامل تھے۔ وہ کفر وشرک، بدعات اور عصر حاضر میں انسانی اقدار کے فقدان اور ان تمام خرافات کو ایک ایک کر کے بیان کر رہے تھے کہ ان کے باعث حیوانیت اپنا ننگا ناچ دکھا رہی ہے۔ تمام نمازیوں کی نظریں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

ابھی دن کے دو بجنے میں پانچ منٹ کم تھے کہ مولوی نعیم الدین نے دنیا میں بسنے والوں کے لئے دعائے خیر کی اور پورے دو بجے جمعہ کا خطبہ پڑھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب مولوی نعیم الدین زبانی خطبہ پڑھ رہے تھے اور تمام نمازی بڑی عظمت کے ساتھ سر جھکائے خطبہ سن رہے تھے۔ وہ جونہی خطبے سے فارغ ہوئے تو سب نمازی صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ چوراہے والی مسجد کی چاروں منزلیں نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ امام نے تکبیر اولیٰ کہی تو تمام مقتدیوں نے دونوں ہاتھ کانوں کی لو تک اٹھائے اور ہاتھ باندھ کے قیام میں مولوی نعیم الدین کی دلگداز قرأت کو کلام الٰہی کی عظمت کے ساتھ سننے لگے۔ پہلی رکعت کے بعد سورۂ رحمٰن پڑھنے لگے تو ان کے رنگین موبائل پر یہ گانا بجنے لگا:

جیون میں پیا تیرا ساتھ رہے
ہاتھوں میں تیرے میرا ہاتھ رہے

وہ زور زور سے سورۂ رحمٰن کی آیات پڑھنے لگے تا کہ موبائل پہ گانے کی آواز کسی کو سنائی نہ دے اور نماز میں خلل نہ پڑے مگر چھوٹی مائک ان کی واسکٹ کی اوپر والی جیب کے ساتھ لگی ہوئی تھی جس کے ذریعے چوراہے والی مسجد کی چوتھی منزل سے باہر بھی ان کی قرأت کے ساتھ ساتھ گانے کی آواز گونج رہی تھی۔ وقفے وقفے کے بعد موبائل پہ گانا بجنے لگتا۔ اب اگر وہ پہلی یا دوسری فرصت میں جیب میں سے موبائل باہر نکال کر اس کا سوئچ آف کرتے تو نماز فاسق ہو جاتی۔ نماز کے تمام مسائل سے وہ بخوبی واقف تھے۔ انہیں اپنا وجود اس حال میں زمین میں دھنستا ہوا معلوم ہوا۔ پسینے پہ پسینے چھوٹنے لگے۔ خدا خدا کر کے وہ جونہی التحیات میں بیٹھے تو موبائل پہ گانا بند ہوا۔ انہوں نے سلام پھیری تو پیچھے کچھ مقتدی آگ بگولہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مولوی نعیم الدین کی ہڈی پسلی ایک کرنے کے لئے آگے بڑھے کہ اتنے میں کچھ نمازی جن کے بچے مولوی صاحب کے پاس قرآن شریف پڑھنے آتے تھے مولوی صاحب کو تحفظ دینے کے لئے آگے آئے۔ ان میں سے ایک نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا:

''جس نے ماں کا دودھ پیا ہے وہ مولوی صاحب کو ہاتھ لگائے۔''

اتنا کہنا تھا کہ دو آدمی اس پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے دیکھتے دو دھڑوں کے درمیان زبردست تصادم شروع ہوا۔ اب وہ آپس میں لاتوں، مکوں اور امام صاحب کی لاٹھی سے ایک

دوسرے کا حق ادا کرنے لگے۔ مولوی نعیم الدین نے جب لڑائی کا یہ بھیانک منظر دیکھا تو وہ مقتدیوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے بھاگ نکلے اور ایک تنگ و تاریک گلی میں گھس گئے۔ وہ اپنے آپ کو ایک بہت بڑا مجرم سمجھ کر کہیں پناہ لینے کی تلاش میں دوڑ رہے تھے اور ادھر چوراہے والی مسجد کی پہلی منزل میں نمازیوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی، کسی کا بازو اور کسی کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ کسی عقلمند نے جب یہ دیکھا کہ مسئلہ قابو میں آنے والا نہیں تو اس نے پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔ کچھ ہی لمحوں میں اعلیٰ پولیس آفیسر اپنے ماتحتوں کے ساتھ چوراہے والی مسجد پر گاڑی لے کر آ گیا اور اس نے آتے ہی مسجد کا محاصرہ کیا اور وہ نمازی کہ جن کا خون ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اور نہ صرف ایک دوسرے کی ماں بہن کی خبر لے رہے تھے بلکہ گتھم گتھا بھی ہو رہے تھے، گرفتار کر لئے گئے اور جو زخمی تھے انہیں اسپتال میں پہنچایا گیا لیکن مولوی نعیم الدین ڈر و خوف کے مارے چوراہے والی مسجد سے بہت دور نکل گئے تھے۔ وہ مسلسل دوڑ رہے تھے۔ بالآخر وہ ہانپتے کانپتے ایک پارک میں پہنچ گئے۔ انہیں اپنی بے عزتی کا شدید احساس ہو رہا تھا اور اس گھڑی پہ پچھتا رہے تھے کہ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے موبائل فون کا سوئچ آف کیوں نہیں کیا۔ حالانکہ مسجد کے گیٹ پر ہی موٹے حروف میں یہ تحریر لکھی ہوئی تھی کہ ''مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنا موبائل بند کر دیجئے'' تین سال میں انہوں نے لوگوں میں جو اعتماد اور عزت و احترام حاصل کیا تھا آج وہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اب انہیں بار بار اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا اور موبائل فون کو وہ زور سے پتھر پر پٹکنا چاہتے تھے۔ انہوں نے غم و غصے کی حالت میں اپنی واسکٹ کی جیب سے اپنا قیمتی موبائل سیٹ باہر نکالا اور اسے اب پتھر پہ پٹکنے ہی والے تھے کہ دل کے کسی گوشے سے آواز آئی کہ آخر یہ تو دیکھوں کہ نماز کے وقت یہ کون خبیث مجھے فون کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ پہ قابو پاتے ہوئے موبائل پر نظر کی تو چھ مسڈ کالیں تھیں۔ دیکھا تو یہ سب ان کی منگیتر اُنہیں فون کر رہی تھی۔ مولوی نعیم الدین کا غصہ فوراً ٹھنڈا پڑ گیا اور موبائل سیٹ واپس پھر جیب میں رکھ دیا مگر اب بھی انہیں یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے چوراہے والی مسجد کے نمازی ابھی ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔

■❖■

پانچ سال کا بن باس

امان اللہ تقریباً ۲۲ برس سے اپنے پسماندہ گاؤں کو چھوڑ کے شہر میں آبسے تھے۔ ان کی ملازمت اور بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ البتہ ان کی زمین اور جھونپڑی نما مکان اب بھی ان کے قبضے میں ہے۔ ان کا تعلق درقبیلہ فہرست ذات سے ہے اور وہ جی پی فنڈ آفس میں ہیڈ کلرک کی پوسٹ پہ تعینات ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں وہ کبھی کبھار چند دنوں کے لئے اپنے آبائی گاؤں چلے جاتے ہیں۔ ان کے گاؤں کی پسماندگی کا یہ عالم ہے کہ ادھر نہ تو کوئی گاڑی جاسکتی ہے اور نہ ہی بجلی اور پانی کا کوئی معقول انتظام ہے۔ اوبڑ کھابڑ راستوں سے گزرنے کے بعد ان کے گاؤں پہنچا جاتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تقریباً ڈیڑھ سو گھر ان کے گاؤں میں موجود ہیں۔

امان اللہ کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ سب سے بڑی بیٹی کا نام ذلفاں بی بی ہے۔ اس سے چھوٹی کا نام منیرہ بی بی، اس سے چھوٹا بیٹا ہے جس کا نام محمد عاطف ہے اور سب سے چھوٹی بیٹی کا نام عاقلہ بی بی ہے۔ امان اللہ خود ایک شریف النفس اور بے عیب آدمی ہیں۔ ان کی بیوی زرینہ اختر پانچویں جماعت تک پڑھی ہیں مگر ایک باسلیقہ اور نفاست پسند خاتون کی جملہ صفات اس میں موجود ہیں۔ امان اللہ اور ان کی اہلیہ نے اپنے بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت اور ان کے اچھے اخلاق و کردار پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ان کی بڑی بیٹی ذلفاں بی بی باٹنی میں ایم ایس سی ہیں، چھوٹی بیٹی بی ایس سی سال اول میں زیر تعلیم ہے جبکہ بیٹا بارہویں جماعت کا طالب علم ہے اور سب سے چھوٹی نویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ امان اللہ کی بیٹیاں اور بیٹا شہری ماحول میں رہتے ہوئے بہت حد تک

دیہات کے ماحول اور وہاں کے رہن سہن کو ناپسند کرتے ہیں۔

امان اللہ کی سب سے بڑی بیٹی ذلفاں بی بی باٹنی میں ایم ایس سی کرنے کے بعد اب کسی موضوع پر ریسرچ کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی کہ اسی دورن بھارت کی مرکزی سرکار نے دیہاتوں میں تعلیم عام کرنے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک نئ تعلیمی پالیسی کو ترتیب دے کر اسے منظوری دی جسے 'عام تعلمی تحریک' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ امان اللہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی بڑی بیٹی ذلفاں بی بی کا اس سے فارم بھروایا۔ ذلفاں بی بی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اسے اپنے آبائی گاؤں کے پرائمری اسکول میں بحیثیت معلمہ کام کرنا ہے تو اس نے حیرت و استعجاب کے عالم میں امان اللہ سے پوچھا:

''پاپا میں باٹنی میں ایم ایس سی ہوں اور گاؤں کے پرائمری اسکول میں بچوں کو پڑھاؤں گی؟ مجھے گاؤں میں نہیں جانا ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ امان اللہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

''بیٹی! بے شک تم باٹنی میں ایم ایس سی ہو مگر تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے
کہ اس زمانے میں بڑی نوکری تو کہاں چھوٹی نوکری بھی نہیں ملتی۔
شہروں میں تعلیم اس قدر عام ہوگئی ہے کہ ہزاروں اعلیٰ تعلیم یافتہ
نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بے روزگاری کے دن گزار رہے ہیں۔ تم
اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنا کہ اگر تمہاری سلیکشن ہو جائے۔''

ذلفاں بی بی نے اپنے باپ کی نصیحت آمیز باتیں سن کر چپ سادھ لی۔ وہ نہایت حسین، حساس اور محنتی تھی۔ بڑی بہن ہونے کے ناطے وہ اپنے اکلوتے بھائی اور چھوٹی بہنوں کی پڑھائی، لکھائی اور ان کے اخلاق و کردار کے بارے میں کافی فکر مند رہتی۔ اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ امور خانہ داری میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد جب ذلفاں بی بی کا نام چیف ایجوکیشن آفیسر کے دفتر میں مرتب کردہ فہرست معلمان میں پہلے نمبر پر آ گیا تو امان اللہ کو اپنی بیٹی کی سلیکشن پہ بے انتہا خوشی ہوئی۔ انہوں نے ذلفاں بی بی کو ساتھ لے کر دفتر سے حکم نامہ حاصل کیا۔ اس کے حکم نامے میں اس کے آبائی

گاؤں کے اسکول کا نام اور ضروری شرائط کے علاوہ اس کی پندرہ سو ماہانہ تنخواہ کا ذکر تھا۔
حکمنامے میں یہ بات بھی درج تھی کہ اس نئی تعلیمی پالیسی کے تحت ایک معلم یا معلمہ کو پانچ
برس کے بعد مستقل طور پر سرکاری ملازمت کے تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے اور دو برس
کے بعد دو ہزار روپے اور پھر تین برس پورے ہونے کے بعد تین ہزار سو روپے تنخواہ ہوگی۔
ذلفاں بی بی کے دل میں خوف اور ذہن میں ایک انجانے وان دیکھے ماحول میں زندگی
گزارنے کا تصور بار بار ابھر رہا تھا۔ باٹنی میں ایم ایس سی پرائمری اسکول میں درس
وتدریس کا کام، پندرہ سو روپے ماہانہ گاؤں کا ماحول، ماں باپ اور بھائی بہنوں سے بہت
دور، سرکاری نوکری ملنے کا احساس مگر فی الحال عارضی طور پر صبر آزمائی کا ایک طویل سلسلہ۔
یہ تمام باتیں ذلفاں بی بی کے ذہن ودل میں کچوکے لگا رہی تھیں مگر اس کے باوجود اس نے
اپنے ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں ہی اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کا عزم کیا اور پھر وہ ایک
دن اپنے باپ کے ہمراہ اپنے بھائی، بہنوں اور ماں سے رخصت لے کر گاؤں چلی گئی۔ وہ
اپنے باپ کے ہمراہ شہر کی کشادہ اور پکی سڑک پر سے گزرنے والی منی بس میں سوار تھی کہ
اچانک بہت دور جانے کے بعد منی بس ایک کچی سڑک پر ہچکولے کھانے لگی۔ سڑک کے
آس پاس مختلف قسم کے درختوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد امان
اللہ نے گاڑی رکوائی اور دونوں باپ بیٹی منی بس سے نیچے اترے۔ اب انہیں ایک کلومیٹر
چڑھائی کا سفر درپیش تھا۔ امان اللہ تو خود بچپن سے اوبڑ کھابڑ راستوں پر چلنے کے عادی تھے
مگر ذلفاں بی بی کے لئے یہ چڑھائی ماؤنٹ ایوریسٹ کی چوٹی پر چڑھنے کے مترادف تھی۔
آخر کار شام ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ذلفاں بی بی اپنے باپ کے ہمراہ تھک ہار کے اپنے
آبائی گاؤں میں پہنچی۔ غفار چودھری گاؤں کے معتبر آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا بڑا
بیٹا عبدل مال مویشی چرانے کا کام کرتا تھا اور چھوٹا بیٹا نصیر فوج میں ملازم تھا ان کی تین
بیٹیاں تھیں۔ تینوں شادی شدہ تھیں۔ غفار چودھری کے گھر پر امان اللہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے
کر چلے گئے۔ چودھری غفار اور ان کے اہل خانہ امان اللہ اور ان کی بیٹی کی آمد پر بہت خوش
ہوئے۔ انہوں نے امان اللہ کو مبارک باد دی۔ کھاٹ پہ نیا کمبل بچھایا دہی لسی کا انتظام کیا۔
لالٹین میں مٹی کا تیل ڈالا۔ گھر کے برآمدے میں پڑے کوڑے کو جھاڑو سے صاف کیا۔

چودھری غفار حقے اپنے منہ سے الگ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ذلفاں بی بی کے سر پہ اپنا دست شفقت پھیرتے ہوئے بولے۔

''ہمارے گاؤں کی پتری جوان ہوگئی ہے رب سکھی رکھے! گاؤں میں روشنی بن کرآئی ہے۔ مالک تندرستی کے ساتھ لمبی عمر دے۔ کسی بات کی بٹیا فکر نہ کرنا جو دال پھلکہ ہمارے گھر میں پکے گا اپنا گھر سمجھ کر کھالینا۔''

ذلفاں بی بی کو غفار چودھری کی باتیں سن کر تھوڑی سی تسلی ملی۔ اس کے چہرے پر بشاشت سی ابھر آئی۔ شب کی سیاہی میں سارا گاؤں ڈوبا ہوا تھا۔ دور دور تک یہاں وہاں گھروں میں چراغوں کی لو ٹمٹما رہی تھی۔ کہاں شہر کی گلیوں اور بازاروں کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی اور لوگوں کی چہل پہل اور کہاں یہ گاؤں کا سنسان ویران سا ماحول، ذلفاں بی بی کو اس ماحول میں اپنا آپ اس رنگین پروں والی فاختہ کی مانند معلوم ہو رہا تھا کہ جو اڑان بھرتے بھرتے کسی خاردار جھاڑی میں پھنس گئی ہو۔ انہی خیالوں میں گم کھانا کھانے کے بعد وہ بستر پہ دراز ہوگئی۔ مگر پریشان کن خیالات اسے بار بار کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ پھر وقفے وقفے کے بعد کہیں دور سے اس کے کانوں میں کسی کتّے کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ دھیرے دھیرے نیند کی پری نے اسے اپنی آغوش میں لے کر بے سدھ کر دیا۔ صبح جب وہ بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ مشرق سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔ غفار چودھری کی بیوی اور اس کی بڑی بہو بھینسوں سے دودھ لے رہی ہیں۔ امان اللہ نے ذلفاں بی بی کو کہا:

''بیٹی تیار ہو جاؤ آج اسکول میں تمہاری جوائننگ ہے۔''

دونوں باپ بیٹی ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اسکول چلے گئے۔ پرائمری اسکول گاؤں کے وسط میں تھا۔ اس میں بھوشن لال نام کا ایک استاد تعینات تھا۔ اسکول کے حاضری رجسٹر میں کل پچاس بچّوں کے نام درج تھے۔ لیکن اسکول میں اس روز پندرہ ہی بچے آئے تھے۔ ذلفاں بی بی نے اپنی جوائننگ رپورٹ لکھی اس کے ساتھ اپنی آرڈر کا پی لگائی اور بھوشن لال کو پکڑائی۔ اسکول کی عمارت دو کمروں پہ مشتمل تھی۔ دو کرسیاں صحیح حالت

گاؤں کے اسکول کا نام اور ضروری شرائط کے علاوہ اس کی پندرہ سو ماہانہ تنخواہ کا ذکر تھا۔ حکمنامے میں یہ بات بھی درج تھی کہ اس نئی تعلیمی پالیسی کے تحت ایک معلم یا معلمہ کو پانچ برس کے بعد مستقل طور پر سرکاری ملازمت کے تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے اور دو برس کے بعد دو ہزار روپے اور پھر تین برس پورے ہونے کے بعد تین ہزار سو روپے تنخواہ ہوگی۔ ذلفاں بی بی کے دل میں خوف اور ذہن میں ایک انجانے وان دیکھے ماحول میں زندگی گزارنے کا تصور بار بار ابھر رہا تھا۔ باٹنی میں ایم ایس سی پرائمری اسکول میں درس وتدریس کا کام، پندرہ سو روپے ماہانہ گاؤں کا ماحول، ماں باپ اور بھائی بہنوں سے بہت دور، سرکاری نوکری ملنے کا احساس مگر فی الحال عارضی طور پر صبر آزمائی کا ایک طویل سلسلہ۔ یہ تمام باتیں ذلفاں بی بی کے ذہن و دل میں کچوکے لگا رہی تھیں مگر اس کے باوجود اس نے اپنے ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں ہی اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کا عزم کیا اور پھر وہ ایک دن اپنے باپ کے ہمراہ اپنے بھائی، بہنوں اور ماں سے رخصت لے کر گاؤں چلی گئی۔ وہ اپنے باپ کے ہمراہ شہر کی کشادہ اور پکی سڑک پر سے گزرنے والی منی بس میں سوار تھی کہ اچانک بہت دور جانے کے بعد منی بس ایک کچی سڑک پر ہچکولے کھانے لگی۔ سڑک کے آس پاس مختلف قسم کے درختوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد امان اللہ نے گاڑی رکوائی اور دونوں باپ بیٹی منی بس سے نیچے اترے۔ اب انہیں ایک کلومیٹر چڑھائی کا سفر درپیش تھا۔ امان اللہ تو خود بچپن سے اوبڑ کھابڑ راستوں پر چلنے کے عادی تھے مگر ذلفاں بی بی کے لئے یہ چڑھائی ماؤنٹ ایوریسٹ کی چوٹی پر چڑھنے کے مترادف تھی۔ آخر کار شام ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ذلفاں بی بی اپنے باپ کے ہمراہ تھک ہار کے اپنے آبائی گاؤں میں پہنچی۔ غفار چودھری گاؤں کے معتبر آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا عبدل مال مویشی چرانے کا کام کرتا تھا اور چھوٹا بیٹا نصیر فوج میں ملازم تھا ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ تینوں شادی شدہ تھیں۔ غفار چودھری کے گھر پر امان اللہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ چودھری غفار اور ان کے اہل خانہ امان اللہ اور ان کی بیٹی کی آمد پر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے امان اللہ کو مبارک باد دی۔ کھاٹ پہ نیا کمبل بچھایا دہی لسی کا انتظام کیا۔ لالٹین میں مٹی کا تیل ڈالا۔ گھر کے برآمدے میں پڑے کوڑے کو جھاڑو سے صاف کیا۔

چودھری غفار حقے اپنے منہ سے الگ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ذلفاں بی بی کے سر پہ اپنا دست شفقت پھیرتے ہوئے بولے۔

''ہمارے گاؤں کی پتری جوان ہوگئی ہے رب سکھی رکھے! گاؤں میں روشنی بن کرآئی ہے۔ مالک تندرستی کے ساتھ لمبی عمر دے۔ کسی بات کی بٹیا فکر نہ کرنا جو دال پھلکہ ہمارے گھر میں پکے گا اپنا گھر سمجھ کر کھالینا۔''

ذلفاں بی بی کو غفار چودھری کی باتیں سن کر تھوڑی سی تسلی ملی۔ اس کے چہرے پر بشاشت سی ابھر آئی۔ شب کی سیاہی میں سارا گاؤں ڈوبا ہوا تھا۔ دور دور تک یہاں وہاں گھروں میں چراغوں کی لوٹمٹما رہی تھی۔ کہاں شہر کی گلیوں اور بازاروں کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی اور لوگوں کی چہل پہل اور کہاں یہ گاؤں کا سنسان ویران سا ماحول، ذلفاں بی بی کو اس ماحول میں اپنا آپ اس رنگین پروں والی فاختہ کی مانند معلوم ہو رہا تھا کہ جو اڑان بھرتے بھرتے کسی خاردار جھاڑی میں پھنس گئی ہو۔ انہی خیالوں میں گم کھانا کھانے کے بعد وہ بستر پہ دراز ہوگئی۔ مگر پریشان کن خیالات اسے بار بار کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ پھر وقفے وقفے کے بعد کہیں دور سے اس کے کانوں میں کسی کتّے کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ دھیرے دھیرے نیند کی پری نے اسے اپنی آغوش میں لے کر بے سدھ کر دیا۔ صبح جب وہ بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ مشرق سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔ غفار چودھری کی بیوی اور اس کی بڑی بہو بھینسوں سے دودھ لے رہی ہیں۔ امان اللہ نے ذلفاں بی بی کو کہا:

''بیٹی تیار ہو جاؤ آج اسکول میں تمہاری جوائننگ ہے۔''

دونوں باپ بیٹی ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اسکول چلے گئے۔ پرائمری اسکول گاؤں کے وسط میں تھا۔ اس میں بھوشن لال نام کا ایک استاد تعینات تھا۔ اسکول کے حاضری رجسٹر میں کل پچاس بچوں کے نام درج تھے۔ لیکن اسکول میں اس روز پندرہ ہی بچے آئے تھے۔ ذلفاں بی بی نے اپنی جوائننگ رپورٹ لکھی اس کے ساتھ اپنی آرڈر کاپی لگائی اور بھوشن لال کو پکڑائی۔ اسکول کی عمارت دو کمروں پہ مشتمل تھی۔ دو کرسیاں صحیح حالت

میں تھیں اور دوخستہ تھیں۔ بچے بغیر وردی کے یوں لگ رہے تھے کہ جیسے کسی پھلدار پیڑ کو پتھر مارنے آئے ہوں۔ اسکول میں گھنٹی کے بدلے لوہے کا ایک ڈنڈا رکھا ہوا تھا جسے اسکول کھولنے بند کرنے اور آدھی چھٹی کے وقت بجایا جاتا تھا۔ ذلفاں بی بی اسکول اور بچوں کی خستہ حالت دیکھ کر حیرت میں پڑ گئی۔ اس کی زبان سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ آج اسے عملی طور پر شہری اور دیہاتی زندگی میں فرق معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے دن امان اللہ نے غفار چودھری سے رخصت لیتے ہوئے کہا:

''میری بیٹی! پہلے تو خدا کے حوالے پھر آپ کے حوالے۔ اس کا خاص خیال رکھیئے گا۔ شہری ماحول سے نکل کر دیہاتی ماحول میں آئی ہے۔ فی الحال پریشان سی لگ رہی ہے۔''

غفار چودھری بولے

''آپ بیٹی کی فکر نہ کیجئے ہم اس کا ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔ یہاں اس کو پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے گھر میں سمجھ لے۔''

امان اللہ نے اپنی بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

''بیٹی خوش رہنا اپنے کام کو عبادت سمجھ کر انجام دینا جب ہمارے لئے اداس ہو جاؤ گی تو شہر چلے آنا۔ ہمت و حوصلے سے کام لینا۔ یہ لو چار ہزار روپے اپنے پاس رکھ لو۔ میری یہ بات یاد رکھنا کہ نیک نیتی، بلند ہمتی اور محنت و لگن سے کام کرنے والے لوگ دنیا میں عزت اور کامیابی والی زندگی گزارتے ہیں۔''

ذلفاں بی بی اپنے باپ کی باتیں سن کر باوجود ضبط کے اپنے آنسوؤں کو نہ روک پائی۔ دو بوند آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ باپ کے شہر جانے کے بعد ذلفاں بی بی نے اپنے آپ میں ہمت و حوصلہ پیدا کیا۔ وہ دل میں یہ عزم لے کر اٹھی کہ وہ ان پانچ برسوں میں اپنے بل بوتے پر ایک خوشگوار انقلاب برپا کرے گی۔ خاص کر اپنے گاؤں کی پسماندگی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ صفائی، سچائی اور پاکیزہ اخلاق و کردار کی

تعلیم پر خصوصی توجہ دے گی۔ اس نے جھجکتے ہوئے غفار چودھری سے کہا:

''چچا! میں آپ کے مکان میں ایک الگ کمرے میں اپنی کتابیں، بستر اور دوسری ضروری چیزیں رکھنا چاہتی ہوں تا کہ میں اسکول میں ڈیوٹی دینے کے بعد اپنی کتابیں پڑھ سکوں۔''

''بیٹی اچھی بات ہے تم اس پچھلے کمرے میں اپنا بستر، کتابیں اور پہننے کے کپڑے رکھ سکتی ہو۔''

انہوں نے خود جا کر ذلفاں بی بی کو کمرہ دکھایا۔ ذلفاں بی بی نے خود جھاڑو سے کمرے میں صفائی کی۔ چارپائی ایک طرف لگائی، بستر پہ نیا بیڈ شیٹ ڈالا، ردی اخباروں کو دیواروں پہ چسپاں کیا اور اس طرح پورا کمرہ بیٹھنے کے لائق بنا دیا۔ موم بتیوں کا پیکٹ وہ دکان سے خرید لائی تا کہ راتکو موم بتی جلا کر لکھنے پڑھنے کا کام کر سکے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد ذلفاں بی بی نے علم نباتات کی کتابوں کے علاوہ سماجیات، اقتصادیات، دینیات اور دنیا کی عظیم شخصیات سے متعلق کتابیں لکڑی کی الماری میں ترتیب سے رکھیں۔ سونے سے پہلے غفار چودھری کی بہو نے اسے دودھ کلا گلاس دیا پھر اس نے اپنا موبائل سیٹ آن کیا گھر میں سب سے فون پہ باتیں کرنے کے بعد موبائل فون کا سوئچ آف کر کے سوگئی۔ صبح وہ جلدی جاگی۔ نماز اور تلاوت کلام پاک کے بعد چائے ناشتے سے فارغ ہوئی۔ قرمزی رنگ کا سوٹ زیب تن کیا اور اسکول چلی گئی۔ بیس منٹ کم دس پہ وہ اسکول پہنچی۔ ابھی کچھ ہی بچّے اسکول میں آئے تھے۔ بھوشن لال دس بج کر دس منٹ پہ اسکول پہنچا بچّوں کو ایک چھوٹے سے گراؤنڈ میں پرارتھنا کرنے کے لئے قطاروں میں کھڑا کیا گیا۔ پانچویں کی دو لڑکیاں سامنے آ کھڑی ہوئیں اور پرارتھنا شروع کی۔ ذلفاں بی بی کو یوں محسوس ہوا کہ بچے پرارتھنا نہیں کر رہے بلکہ بے سُری آواز میں آہ وزاری کر رہے ہیں۔ پرارتھنا کے بعد بچّوں کو اپنی کلاسوں میں جانے کو کہا گیا۔ تمام بچّے بھگدڑ مچاتے ہوئے چلے گئے۔ آخر میں بھوشن لال اور ذلفاں بی بی اسکول کے آفس میں چلے گئے۔ بھوشن لال کافی سینئر ٹیچر تھے محکمہ تعلیم میں وہ بیس برس سے کام کر رہے تھے۔ ذلفاں بی بی نے بڑے پر اعتماد لہجے میں بھوشن لال سے کہا۔

''سر! ہمیں اپنے اسکول کو مثالی اسکول بنانے کے لئے کامیاب منصوبہ بندی کے تحت ٹھوس اقدامات اٹھانے پڑیں گے۔ اس سلسلے میں مجھے آپ کا بھرپور تعاون چاہیئے۔''

بھوشن لال نے کہا

''میں تو آپ کا ساتھ دوں گا لیکن آپ نے یہ مشہور ضرب المثل ضرور سنی ہوگی کہ ''جیسا دیس ویسا بھیس'' یہ گاؤں کا پرائمری اسکول ہے اسے کیا مثالی اسکول بناؤ گی ذلفاں بی بی؟''

ذلفاں بی بی نے جواب دیا۔

''سر! انسان کو نیک نیتی سے کام کرنا چاہیئے۔ میں دیس اور بھیس میں بدلاؤ چاہتی ہوں، لہٰذا ہمیں ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم اپنی استعداد کے مطابق کوشش تو کریں۔''

بھوشن لال نے کوئی بھی دلیل نہیں دینا چاہی۔ خاموش رہے پھر آہستہ سے کہا ''چلیئے آپ بدلاؤ کی مہم شروع کر کے دیکھ لیں۔''

ذلفاں بی بی نے سب سے پہلے اسکول کا ٹائم ٹیبل بدلا۔ پانچویں اور چوتھی کلاس کے تمام مضامین اپنے نام پہ رکھتے ہوئے بھوشن لال کو پہلی سے تیسری تک کی کلاسیں پڑھانے کو دیں۔ بچّوں کو چھٹی ہونے سے پہلے اسکول کے احاطے میں بٹھایا۔ انہیں اسکول کی وردی کی اہمیت سمجھائی۔ نیلے رنگ کی پتلون اور سفید رنگ کی قمیص سلوانے کو کہا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو وردی تیار کروانے کی ہدایت دی۔ دوسرے دن اس نے بھوشن لال کو یہ مشورہ دیا۔

''سر میں چاہتی ہوں کہ سرپنچ صاحب اور اس گاؤں کے اسکول کمیٹی ممبران کو بذریعہ نوٹس کل یہاں مدعو کیا جائے تاکہ ان کی موجودگی میں ہم اس اسکول کو مڈل اسکول بنانے، گاؤں میں بجلی، پانی اور سڑک کا معقول انتظام کرنے کا تحریری طور پر منصوبہ تیار کر کے انہیں حکامِ اعلیٰ کے پاس بھیجیں۔''

بھوشن لال متفق ہوئے۔ انہوں نے کہا ''ہاں کل یہی کام کریں گے تمہارا مشورہ اچھا ہے۔''

دوسرے دن ذلفاں بی بی اور بھوشن لال نے سرپنچ اور اسکول کمیٹی ممبران کے نام دعوتی رقعے لکھ کر بچوں کے ہاتھ ان تک پہنچانے کو دیے۔ سرپنچ اور ممبران کمیٹی جب اسکول میں آئے تو ذلفاں بی بی نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا:

''ہم آپ کے مشکور و ممنون ہیں کہ آپ اپنا قیمتی وقت نکال کر یہاں تشریف فرما ہوئے۔ میں اسکول اور پورے گاؤں کے بارے میں آپ کے سامنے چند اہم اور بنیادی مسائل رکھنا چاہتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آج کی اس میٹنگ میں ہم سب جو فیصلہ لیں گے اسے عملی جامہ پہنانے کی خاطر آپ ہر طرح کی قربانی دیں گے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس پرائمری اسکول کو مڈل اسکول بنانا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پورے گاؤں میں بجلی نہیں ہے۔ تیسری بات یہ کہ ہمارا اسکول اور گاؤں واٹر سپلائی اسکیم سے محروم ہے۔ چوتھی بات یہ کہ اسکول کی عمارت بچّوں کے لئے ناکافی ہے۔ پانچویں بات یہ کہ پردھان منتری گرام سڑک یوجنا کے تحت ہمارا گاؤں نہیں لایا گیا ہے۔ یہ وہ اہم اور بنیادی مسائل ہیں جن کو حل کرنے کے لئے ہم سب کو جدوجہد کرنی پڑے گی۔ آپ نے یہ ضرور سنا ہوگا کہ 'بن روئے ماں بچےّ کو دودھ نہیں دیتی' آپ کو میں یہ یقین دلاتی ہوں کہ اگر آپ حکومت وقت کے اعلیٰ افسران یعنی پانی، سڑک، بجلی اور تعلیم کے وزیر تک رسائی حاصل کریں اور تحریری صورت میں انہیں اپنے مطالبات پیش کریں گے تو انہیں منظوری مل جائے گی۔''

گاؤں کے سرپنچ اور دوسرے ممبران اسکول کمیٹی نے ذلفاں بی بی کی تعمیراتی سوچ اور اس کی باتیں سن کر نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ سب نے بیک آواز افسران اعلیٰ سے اپنے مطالبات کو پورا کروانے کا مصمم ارادہ بھی کیا۔ ذلفاں بی بی نے بجلی، پانی، سڑک

اور تعلیم کے وزیر کے نام الگ الگ درخواستیں لکھیں ان پر سرپنچ، ممبران اسکول کمیٹی اور گاؤں کے بہت سے لوگوں کے دستخط کروائے اور سرپنچ کو یہ تمام درخواستیں سونپیں۔ میٹنگ برخاست ہونے کے بعد بھوشن لال اپنے گھر گئے اور ذلفاں بی بی اپنے ڈیرے پر چلی آئی۔ اس نے کھانا کھایا۔ نماز عصر پڑھی اور تسبیح لے کر بستر پر لیٹے لیٹے اللہ کا ذکر کرنے لگی۔ دوسرے دن جب وہ بروقت اسکول پہنچی تو اس نے سب سے پہلے بچّوں کو گراؤنڈ میں قطاروں میں کھڑا کیا۔ انہیں پرارتھنا کروانے کے بعد نیچے بیٹھنے کو کہا۔ پھر اس نے انہیں صحت، صفائی اور نظم وضبط کے بارے میں لیکچر دیا۔ اس کے بعد کلاسوں میں بھیج دیا۔ جب وہ آفس میں آئی تو اس نے بھوشن لال کو کہا:

"سر! ہمارے اسکول میں گھنٹی نہیں ہے جب بچّے لوہے کا ڈنڈا بجاتے ہیں تو میں ڈر جاتی ہوں۔ میں اگلے ہفتے اپنے والدین کے پاس شہر جا رہی ہوں میں اسکول کے لئے اچھی سی گھنٹی خرید لاؤں گی۔ دوسری بات یہ کہ آپ مجھے اسکول فنڈ پوزیشن دکھایئے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہماری کیش بکس میں کتنا روپیہ ہے۔"

بھوشن لال کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ٹرنک سے تمام کیش بکس نکال کر ذلفاں بی بی کے سامنے رکھیں اور اسے کہنے لگے۔

"ان کیش بکوں میں کیش ان ہینڈ اور کیش ان بینک کی تفصیل ایک الگ کاغذ پر نوٹ کریں، ویسے میں نے ان کیش بکوں کو بڑی حفاظت میں رکھا ہے اور بچّوں کا یہ پیسہ خرچ کرنا میں گناہ خیال کرتا ہوں۔"

ذلفاں بی بی کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکان ابھر آئی وہ بولی

"سر گھنٹی بلڈنگ فنڈ سے خریدی جائے گی۔ اس لئے میں سب سے پہلے بلڈنگ فنڈ والی کیش بک چیک کرتی ہوں۔"

بھوشن لال نے کہا "ہاں ٹھیک ہے۔"

ذلفاں بی بی نے بلڈنگ فنڈ والی کیش بک میں تاحال دس ہزار روپے کیش ان

بینک دیکھا اور کیش ان ہینڈ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد اس نے غریب فنڈ کیش بک پہ نظر دوڑائی تو اس میں سات ہزار روپے کیش ان بینک پایا۔ اسی طرح پرنٹنگ فنڈ میں چھ ہزار روپے اور کھیلوں والی کیش بک میں آٹھ ہزار روپے کیش ان بینک تھا۔ پاس بکوں میں بھی اسی طرح کا اندراج تھا۔ غرض کہ کل ملا کر تمام کیش بکوں میں تقریباً تیس ہزار روپے تھا جو بینک میں جمع تھا۔ ذلفاں بی بی یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوئی پھر اس نے بھوشن لال کو سجھاؤ دینا چاہا اس نے کہا:

''سر! اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان تمام کیش بکوں کا چارج آپ مجھے دے دیجئے میں ان کیش بکوں میں جمع شدہ رقم ایک ضابطے کے تحت بچّوں اور اسکول پہ خرچ کروں گی۔''

بھوشن لال خوش ہوئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے ان کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتار رہا ہو۔ انہوں نے ذلفاں بی بی کو کہا:

''ہاں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ تمام کیش بکس اگر آپ کے چارج میں رہیں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔''

ذلفاں بی بی نے کہا:

''سر میں چاہتی ہوں کہ اسکول آفس کو بیٹھنے کے لائق بنایا جائے۔ میں چونکہ تین دن کے بعد اپنے والدین کے پاس شہر جارہی ہوں اس لئے چند اہم چیزوں کی فہرست بناؤں گی اور آپ مجھے فی الحال چار ہزار روپے کا چیک بلڈنگ فنڈ میں سے کاٹ کر دیجئے۔'' بھوشن لال نے چیک کاٹ کر دے دیا۔

ذلفاں بی بی نے بھوشن لال کا شکریہ ادا کیا اور پانچویں کلاس میں بچّوں کو پڑھانے چلی گئی۔ بچّے شور کر رہے تھے۔ وہ جونہی کلاس میں پہنچی تو بچّے چپ ہوگئے۔ اس نے انہیں سب سے پہلے انگریزی پڑھائی، پھر حساب پڑھایا۔ انہیں گھر کیلئے کام کرنے کو دیا۔ اس کے بعد اس نے چوتھی کلاس کے بچّوں کو سائنس اور سوشل سائنس پڑھائی۔ انہیں بھی گھر کے لئے کام دیا۔ ریسس کے دوران اس نے پانچویں کلاس کی چار لڑکیوں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں یہ پرارتھنا لکھ کر دی:

اے مالک تیرے بندے ہم ایسے ہوں ہمارے کرم
نیکی پر چلیں اور بدی سے ٹلیں تا کہ ہنستے ہوئے نکلے دم

ذلفاں بی بی نے مترنم آواز میں لڑکیوں کو پرارتھنا سکھانے کی ریہرسل کرائی اور آنے والے کل یہی پرارتھنا کرنے کو کہا۔ چار بجے کے بعد ذلفاں بی بی اپنے ڈیرے پہ آئی تو اس نے اسکول آفس کمرے کو سجانے اور اس میں ضروری اشیا کی فہرست تیار کی جس میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی کرسی کے اوپر رکھا جانے والا تولیہ، ہاتھ دھونے والا صابن، بڑے سائز کا آئینہ جو چہرہ دیکھنے کے لئے دیوار کے ساتھ آویزاں ہو، وال کلاک، چھ شیشے کے گلاس، درمیانہ سائز کی پیتل کی گھنٹی، دو اچھی سی کرسیاں اور ہندوستان کے مجاہدین آزادی کی تصاویر شامل تھیں۔ شام کے ملگجی سائے پھیلنے لگے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے وضو بنایا اور نماز مغرب ادا کی۔ برسات کی بھیگی رات تھی جس کی وجہ سے اس پہ غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ مگر اس کے کمرے میں مچھروں نے اس کے کانوں کے قریب آ کر اپنا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ وہ دیر تک اپنے مخملیں وجود پہ یہاں وہاں ہاتھ مارتی رہی کہ اتنے میں غفار چودھری کی بیوی نے اسے کھانا کھانے کو کہا وہ اٹھی اور کھانا کھانے چلی گئی۔ کھانا کھانے کے بعد جب وہ غفار چودھری کی آٹھ سالہ پوتی کے ساتھ مکان سے باہر آئی تو اس نے آسمان پہ چمکتے چاند کو دیکھ کے مسرت اور روحانی آسودگی محسوس کی۔ تب اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ روشنی چاند کی ہو یا سورج کی اندھیرے کی دشمن ہوتی ہے۔ اسی طرح جس طرح سچ جھوٹ کا دشمن ہوتا ہے۔ وہ کچھ دیر تک سوچ کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زنی کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ دنیا کے تمام مذاہب، عقیدے، دھرم، فکر و فلسفے، پیغمبر، اوتار، رشی منی، صوفی سنتوں کی تعلیم، تمام علوم و فنون اور دانش گاہوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آدمی کو اس دنیا میں انسان بنایا جائے۔ اس میں چھپے کام، کرودھ، موبھ، لوبھ اور اہنکار کو ختم کیا جائے۔ پھر جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو یہ دیکھ کے حیران رہ گئی کہ بلّی نے چوہے کو اپنے دانتوں تلے دبا رکھا ہے اور چوہا اُس سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ ذلفاں بی بی کو دیکھتے ہی بلی چوہے کو لے کر الماری کے پیچھے چلی گئی اور آہستہ آہستہ غرانے لگی۔ لمحہ بھر کے بعد بلّی نے چوہے کو اپنے نوکیلے دانتوں کی گرفت سے آزاد کیا۔ چوہا زمین

پرسر کنے لگا۔ پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو بلّی فوراً اس پہ جھپٹ پڑی۔ بلّی چوہے کا یہ کھیل وہ دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر جب وہ بستر پہ آئی تو چوہے کی دلدوز چیخیں اسے سنائی دیں۔ وہ سمجھ گئی کہ ایک جاندار زندگی کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ معاً اسے اپنی کتابوں کی طرف دھیان گیا وہ بستر سے اٹھی اور لکڑی کی الماری میں ترتیب سے رکھی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی کہ کہیں چوہوں نے انہیں کترنا شروع نہ کیا ہو۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کتابیں محفوظ تھیں تب اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ بلّی ایک فائدہ مند جانور ہے اور چوہا نقصان کرنے والا۔ وہ دوبارہ بستر پہ دراز ہوگئی۔ مگر ماں باپ اور بھائی بہنوں کی یاد نے اسے کروٹیں بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اسے دل ہی دل میں یہ خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ کل وہ شہر اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے پاس چلی جائے گی۔ اسی خوشی میں اس کی آنکھوں میں نیند اتر آئی اور وہ خوابوں کی دنیا میں چلی گئی۔ دوسرے دن وہ صبح جلدی جاگی اور غفار چودھری کی بہو کو ساتھ لے کر ایک باؤلی پہ نہانے چلی گئی۔ نہانے کے بعد اس نے نماز فجر پڑھی۔ اس کے بعد دعائے گنج العرش پڑھنے بیٹھ گئی۔ خدا سے کل عالم میں بسنے والوں کے لئے امن وسلامتی اور ہدایت کی دعا کی۔ پھر وہ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اسکول کے لئے تیار ہوگئی۔ اسکول میں وہ صرف ایک گھنٹہ رہی اور پھر اس نے بھوشن لال کو کہا:

''اچھا سر! میں اب گھر جارہی ہوں۔ ایک ہفتے کے بعد آؤں گی۔ میں نے اسکول آفس کے لئے ضروری چیزوں کی فہرست تیار کی ہے میں وہ تمام چیزیں نیچے سڑک کے کنارے دکان پہ رکھوں گی اور کسی مزدور کو مزدوری دے کر یہاں پہنچاؤں گی۔''

بھوشن لال نے کہا:

''جائیے میری طرف سے اجازت ہے۔''

ذلفاں بی بی جب ڈیرے پہ آئی تو غفار چودھری کی بیوی نے اس کے گھر والوں کے لئے ٹماٹر، بھنڈی، کھیرے اور بیگن ایک تھیلے میں ڈال رکھے تھے۔ وہ خوش ہوگئی پھر جب وہ غفار چودھری اور اس کی بیوی سے رخصت لینے لگی تو غفار چودھری نے کہا

''بیٹی ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں، تمہیں گاڑی پہ بٹھا

آؤں گا۔''

ذلفاں بی بی غفار چودھری کے ہمراہ اپنے گاؤں سے نیچے سڑک پہ آئی۔ اس نے اپنا موبائل فون دکان پہ چارجنگ پہ لگا یا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے دور سے شہر جانے والی منی بس نظر آئی۔ غفار چودھری نے ہاتھ دکھا کر منی بس رکوائی اور ذلفاں بی بی اس پہ سوار ہو گئی۔ تین گھنٹے کے بعد وہ اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے پاس چلی گئی۔ اس نے سب سے پہلے ماں کو سلام کیا، اسے گلے لگایا پھر باپ کے پاس گئی اس سے دعائیں لیں اپنے بھائی بہنوں کی خیریت دریافت کی، خوشی اور اطمینان سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ دوسرے دن جب وہ بازار میں ایک جگہ اپنی سہیلیوں سے ملی تو ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے کہا:

''کب کی بچھڑی کہاں آ کے ملی۔''

ذلفاں بی بی نے جواب دیا ''میں رو پڑتی ہوں جب گزرا زمانہ یاد آتا ہے'' ذلفاں بی بی کی تینوں سہیلیوں نے ہنستے ہوئے کہا:

''واہ! اری تو تو شاعرہ بن گئی ہے۔''

''شاعری نہیں کر رہی ہوں سچ کہتی ہوں وقت اور مسائل حیات انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ گردش روز و شب نے ہم سے ہمارا بچپن اور لڑکپن چھین لیا ہے میری سہیلیو جو آج ہے وہ کل نہیں ہو گا۔''

ذلفاں بی بی کی ایک اور سہیلی نے اسے کہا ''یار فلاسفی تیرا سبجیکٹ تو رہا نہیں ہے لیکن تیری ہر بات فلسفیانہ ہوتی ہے۔''

ذلفاں بی بی بولی ''اچھا چھوڑو یہ باتیں آؤ میں تمہیں گول گپے کھلاتی ہوں مجھے گول گپے بہت پسند ہیں۔ تمہیں یاد ہو گا کالج کے باہر گیٹ کے ایک طرف ہم اکثر کالج سے نکلنے کے بعد گول گپے کھایا کرتی تھیں۔''

چاروں گول گپے کھانے لگیں۔ گول گپے والے نے مرچ تھوڑی تیز رکھی تھی۔ وہ سُو سُو کرتی رہیں۔ پیسے دینے کی باری آئی تو ذلفاں بی بی نے پہل کی پھر وہ اپنی سہیلیوں کو کسی شاعر کا یہ شعر سناتی ہوئی ان سے رخصت ہونے لگی۔

میری زندگی کا حاصل کہ سب کو فیض پہنچے
میں چراغ راہ گزر ہوں مجھے شوق سے جلانا

اس کی سہیلیوں کو شعر بہت پسند آیا تو ان میں سے ایک نے کہا ''بہت خوب! جیتی رہو'' اچھا او کے تھینک یو'' اور وہ ان سے رخصت ہوگئی۔ تین دن کے بعد ذلفاں بی بی نے اپنے اسکول آفس کے لئے تیار کردہ تمام ضروری اشیا کی فہرست کے مطابق چیزیں خریدیں۔ انہیں بس اڈے کے قریب ایک دکاندار کے پاس رکھا اور گھر چلی گئی۔ گھر پہنچ کر اس نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ اپنے بھائی اور بہنوں کی پڑھائی کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔ انہیں محنت سے کام کرنے کی نصیحت کی اور اس کے بعد اپنے پہننے کے کپڑے، ٹوتھ پیسٹ، غازہ، کریم، نہانے اور کپڑے دھونے والا صابن اور آملے کا تیل ایک بیگ میں ڈالا۔ تیسرے دن اسے واپس گاؤں میں اپنی ڈیوٹی پہ جانا تھا۔ اس نے ماں کو گھر کا کوئی بھی کام کرنے نہیں دیا۔ اس نے کہا۔

''اماں آپ آرام کیجئے، میں گھر کے سبھی کام خود کروں گی؟ ابھی میں دو دن گھر پر ہی ہوں کسی بھی چیز کی فکر نہ کیجئے گا۔''

ماں کی زبان سے بے ساختہ یہ دعا نکل گئی ''جیتی رہو میری بیٹی سدا خوش رہو اللہ تمہیں تندرستی اور لمبی عمر بخشے۔''

ذلفاں بی بی نے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے میلے کپڑے واشنگ مشین میں ڈالے۔ کچھ وقت کے بعد انہیں مشین سے نکال کے دھوپ میں سکھانے کے لئے ڈال دیا۔ گھر آنگن میں پڑی ہر چیز کو صاف ستھرے طور پر ترتیب سے رکھا۔ شام کا کھانا تیار کیا اور اس کے بعد اپنے گھر کے لان میں اپنی چھوٹی بہن عاقلہ کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلنے لگی۔ کچھ دیر تک وہ اپنی بہن کے ساتھ کھیلتی رہی پھر اچانک اس کے کانوں میں شہر کی جامع مسجد سے نماز مغرب کی اذاں گونجی تو اس نے کھیلنا بند کر دیا اور اپنی بہن کو نماز پڑھنے کو کہا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد اس نے ماں اور باپ کے سر میں تیل لگایا خوب مالش کی اور اس کے بعد نماز عشا پڑھ کے سوگئی۔

دو دن کے بعد ذلفاں بی بی گاؤں میں اپنی ڈیوٹی پہ چلی گئی۔ اس نے اسکول آفس

کا سامان سڑک کے کنارے ایک دکان پہ منی بس سے اتار کے رکھا۔ دکاندار نے اس کے ساتھ ایک مزدور سامان لے کر بھیجا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ مزدور کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں پہنچ گئی۔ اس نے اسکول کھلوایا اور سارا سامان اسکول آفس میں رکھوایا۔ مزدور کو مزدوری دی اور اپنے ڈیرے پہ چلی آئی۔ سفر کی تھکان کی وجہ سے اسے اپنے آپ میں درد کی ٹیسیں ابھرتی محسوس ہوئیں۔ اس نے غفار چودھری اور ان کے اہل خانہ کی خیریت معلوم کی۔ اپنے بیگ سے ان کی پوتی کے لئے جھنجھنا نکال کر اسے پکڑایا وہ بڑی خوش ہوئی اور اس سے کھیلنے لگی۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد ذلفاں بی بی سوگئی۔ صبح وہ کوئل کی کوک اور پپیہے کی چہک سن کے بیدار ہوئی۔ وہ اٹھی، چائے ناشتے سے فارغ ہوئی اور اسکول چلی گئی۔ اسکول میں اس نے بھنگن کو بلایا اسکول آفس اور باقی تمام کمروں کی صفائی کروائی۔ پھر ان تمام چیزوں کو ترتیب سے اسکول آفس میں رکھا جو وہ شہر سے خرید لائی تھی۔ آخر میں جب اس نے بچّوں سے پیتل کی گھنٹی بجوائی تو اس کی بازگشت کانوں میں رس گھولنے لگی۔ گھنٹی کی آواز سن کر اسکول کے گرد ونواح کے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ ان کی نگاہیں اسکول پہ مرکوز ہوگئیں۔ اسی دوران بھوشن لال اسکول پہنچ گئے۔ انہوں نے جونہی اسکول آفس میں قدم رکھا تو ہر چیز کو سلیقے سے رکھا ہوا پا کر خوش ہوگئے۔ ذلفاں بی بی نے آداب بجالاتے ہوئے ان سے پوچھا:

''سر اب آپ کو اسکول کا آفس کیسا لگ رہا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا ''بہت اچھا لگ رہا ہے آپ نے کوئی کسر نہیں رکھی ہے۔''

پرارتھنا کرنے کے بعد جب سبھی بچّے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے تو بھوشن لال نے ذلفاں بی بی کو آفس میں بلایا اور کہنے لگے۔ ''میں نے آپ کو چار دن کی ڈیوٹی پہ رکھا ہے اور تین دن خالی رکھے ہیں۔ اس لئے آپ ان تین دنوں کے دستخط کر لیجئے۔''

ذلفاں بی بی نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا وہ کہنے لگی۔

''سر آپ میری ان تین دنوں کی چھٹی لگا دیجئے میرا ضمیر نہیں مانتا ہے کہ میں دستخط کروں اور یوں بھی جب میں یہاں نہیں تھی تو اس کے باوجود میں دستخط کروں یہ تو گناہ ہے''

بھوشن لال حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگے پھر بولے

''ذلفاں بی بی آپ ان تین دنوں کے دستخط کر لیجئے یہاں کون دیکھ رہا ہے۔''

ذلفاں بی بی نے جواب دیا

''سروہ نیلی چھتری والا تو دیکھ رہا ہے'' اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ بھوشن لال نے مجبور ہو کر ٹیچر حاضری رجسٹر پہ ذلفاں بی بی کی تین دنوں کی چھٹی لکھ دی۔ وہ اٹھی اور پانچویں کلاس میں پڑھانے چلی گئی۔ اس نے بلیک بورڈ پہ بچّوں کو حساب سمجھایا، پھر انگریزی اور سائنس پڑھائی۔ ان کی کاپیاں چیک کیں، صحیح پڑھنا لکھنا اور بولنا سکھایا۔ آدھی چھٹی کے بعد جب وہ چوتھی جماعت کے بچّوں کو پڑھانے گئی تو کرسی پہ بیٹھتے ہی اس کے پاس ایک بچّہ روتا ہوا آیا اور دوسرے بچّے کی شکایت کرنے لگا۔

''میڈم جی! اس نے مجھے تھپّڑ مارا''

دوسرے لڑکے نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ''میڈم جی! اس نے مجھے گالی دی۔''

ذلفاں بی بی نے دونوں کو سمجھایا اور واپس اپنی جگہ بھیج دیا۔ بچّوں کے شور اور ان کی طرح طرح کی شکایتیں سن کر کبھی کبھی وہ جھنجھلاہٹ میں آکر ان کے کان مروڑتی اور جب بچّے پوری توجہ سے اس کی باتیں سنتے تو وہ خوشی محسوس کرتی۔ بچّوں کی نفسیات کا خیال رکھتے ہوئے انہیں نصیحت آمیز چھوٹی چھوٹی کہانیاں سناتی، بچے کبھی تو ہنستے اور کبھی حیران رہ جاتے۔

ذلفاں بی بی کو بحیثیت رہبر تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں کام کرتے اب تقریباً تین ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ماہانہ پروگریس رپورٹ کے لئے اسے سرپنچ اور پنچوں کے دستخط کروانے پڑتے جس کے لئے اسے کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پھر جب اسے رہبر تعلیم ٹیچرز فورم نے بلاک صدر کی ذمہ داری سونپی تو اس کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے ضلع کی سطح پر بہت سی میٹنگوں میں شرکت کر کے پر جوش تقریریں کیں۔ ایک سال کے بعد جب ٹیچرز فورم نے حکومت کے سامنے اپنی تنخواہ میں اضافے کی مانگ کے لئے آواز بلند کی اور مانگ

پوری نہ ہونے کی صورت میں یہ فیصلہ کیا کہ تمام رہبر تعلیم ٹیچرز ایک روزہ احتجاجی ریلی میں شامل ہوکر سکریٹریٹ کا گھیراؤ کریں گے تو ذلفاں بی بی بھی بامر مجبوری اس ریلی میں شامل ہوگئی۔ پورے جوش اور ولولے اور نعرے بازی کے ساتھ وہ اپنے ساتھیوں کی قیادت میں آگے بڑھ رہی تھی کہ سکریٹریٹ سے پہلے ہی چند گز کے فاصلے پر مردانہ اور زنانہ پولیس نے اس احتجاجی ریلی کو روک لیا۔ ذلفاں بی بی نے ہلّہ بول دیا اور تمام ٹیچرز نے بیک وقت آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن پولیس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ کئی ٹیچرز زخمی ہوگئے۔ کئی ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ذلفاں بی بی پہ بھی ایک پولیس والی عورت نے اس کی ٹانگوں پہ بانس کے ڈنڈے سے وار کیا وہ بلبلا کر ایک طرف گر پڑی۔ تب اسے یہ احساس ہوا کہ کسی منزل مقصود کو پانے کی خاطر آدمی کو بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ وہ سارا احتجاجی جلوس پولیس کے لاٹھی چارج سے تتر بتر ہوگیا تھا وہ آہستہ آہستہ کھڑی ہوگئی اور اپنے گھر چلی آئی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ دو دن گھر پہ رہنے کے بعد جب وہ ڈیوٹی پہ چلی گئی تو اسے معلوم ہوا کہ غفار چودھری کا چھوٹا بیٹا نصیر دو ماہ کی چھٹی لے کر گھر آیا ہے۔ ذلفاں بی بی کی اس پہ نظر پڑی تو اسے پہلی نظر میں نصیر کی نہ تو شکل وصورت اچھی لگی اور نہ ہی چال چلن۔ وہ گھر سے باہر ایک جگہ سگریٹ کے کش لے کر دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑ رہا تھا۔ ذلفاں بی بی اس سے نظریں چرانے اور دور دور رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتی مگر وہ ہر بار اس کے سامنے آکر باتیں کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک روز ذلفاں بی بی بن سنور کے اپنی ڈیوٹی پہ جا رہی تھی کہ اچانک نصیر اس کی راہ میں حائل ہوا اور کہنے لگا:

''ہم ترستے ہیں تم سے باتیں کرنے کے لئے اور تم نے ہم سے باتیں تو دور نگاہیں تک چرانے کی قسم کھا رکھی ہے۔''

ذلفاں بی بی نصیر کی باتیں سن کر حواس باختہ ہوگئی۔ شرم وحیا سے اس کا چہرہ عرق آلود ہوگیا۔ اس نے نصیر کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا ہمت کر کے صرف اتنا کہا:

''میرے راستے سے ہٹ جایئے میں اسکول کے لئے لیٹ ہو رہی ہوں۔''

نصیر راستے سے ہٹ گیا اور ذلفاں بی بی آگے بڑھی، اسے شراب کی بو سی آنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اسکول میں وہ سارا دن مایوس رہی، نصیر کی

باتوں پر اسے اندر ہی اندر غصہ آرہا تھا پھر اس نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ وہ غفار چودھری کے گھر سے اپنا ڈیرہ اٹھالے گی۔ ایک رات کہیں سے گاؤں میں چترا آ گیا اس نے غفار چودھری کے بھائی کی چار بھیڑیں ماردیں۔ دوسرے دن سارا گاؤں چترے کی خبر سن کر سہم گیا۔ ذلفاں بی بی بھی نہایت پریشان ہوگئی۔ غفار چودھری کے گھر سے اس کے اسکول تک پہنچنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ جاتا تھا اور وہ بھی جنگلی راستے سے گزرنا پڑتا تھا۔ پندرہ دن کے بعد ذلفاں بی بی نے اسکول کے ساتھ ہی ترلوچن سنگھ کے گھر میں کمرہ کرائے پہ لیا، جس روز اس نے غفار چودھری کے مکان سے اپنا سامان مزدور سے اٹھوایا تو غفار چودھری دنگ رہ گئے۔ انہوں نے حیرت آمیز لہجے میں اس سے پوچھا۔

''بیٹی! یہ تم کیا کر رہی ہو، یہاں کیا تمہیں کوئی تکلیف پہنچی یا کسی نے کچھ کہا، آخر کیا بات ہے؟''

ذلفاں بی بی نے جواب دیا

''نہیں چچا کسی نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ آپ سب نے مجھے بہت آرام سے رکھا لیکن کیا کروں مجبوراً یہاں سے جانا پڑ رہا ہے کیونکہ چترا گاؤں میں آ گیا ہے اور اب یہاں سے اکیلی اسکول نہیں جاسکتی ہوں مجھے چترے سے ڈر لگے ہے۔''

غفار چودھری کے منع کرنے کے باوجود ذلفاں بی بی ان کے گھر سے چلی گئی۔

ترلوچن سنگھ کو اس نے اپنا بھائی بنالیا تھا۔ وہ نہایت شریف، دیانتدار، غیرت منداور بے باک تھا۔ اس نے ذلفاں بی بی کو یقین دلایا کہ وہ اسے اپنی سگی بہن کی طرح اپنے گھر میں رکھے گا۔ وہ اپنے لئے خود کھانا پکاتی لیکن ترلوچن سنگھ نے اس سے مہینہ پورا ہونے پر کرایہ نہیں لیا۔ ترلوچن سنگھ کی دو بیٹیاں تھیں بیٹا نہیں تھا۔ بڑی بیٹی دوسری جماعت میں پڑھتی تھی، ذلفاں بی بی اسے صبح وشام کو پڑھاتی۔ بچوں کی وردی، ان کی صحت صفائی، ان کے نظم وضبط اور لکھائی پڑھائی پہ وہ خاص دھیان دیتی۔ غریب گھرانوں سے آئے ہوئے بچوں کی اس نے ایک فہرست تیار کی اور انہیں اسکول کے غریب فنڈ سے بوٹ اور گرم سوئٹر خرید کردیے۔ علاوہ ازیں ان بچوں کی بھی ایک فہرست بنائی تھی جو بغیر نہائے دھوئے اسکول

آتے تھے۔ اسکول سے تھوڑی دوری پر پانی کی ایک باؤلی پہ ہفتہ میں ایک دن ان بچّوں کو اسکول سے نہانے کا صابن اور سرسوں کا تیل دے کے نہانے کے لئے بھیجا جاتا۔ اس طرح ذلفاں بی بی کی یہ حتی الوسع کوشش رہتی کہ ان کے اسکول کے بچّے نہ صرف پڑھائی لکھائی میں اول نمبر پر رہیں بلکہ صحت، صفائی، تہذیب و شائستگی اور نظم وضبط میں بھی آگے رہیں۔ ذلفاں بی بی اس دن بہت خوش ہوئی تھی جس دن اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کے ہاتھوں لکھی گئی وزرا کے نام درخواستوں میں سے بجلی اور پانی کے وزیر نے منظوری دے دی ہے اور چند دنوں کے اندر اس کے آبائی گاؤں میں بجلی کے کھمبے لگیں گے اور واٹر سپلائی اسکیم والا عملہ بھی بہت جلد پانی کی پائپیں بچھانے آرہا ہے۔ ایک سال کے اندر پورے گاؤں میں بجلی کے کھمبے اور پانی کے لئے لوہے کی پائپیں بچھا دی گئی تھیں۔ دوسرے سال میں پردھان منتری گرام سڑک یوجنا کے تحت ذلفاں بی بی کے گاؤں میں بھی سڑک کو منظوری مل گئی۔

ذلفاں بی بی کو اب اپنے آبائی گاؤں کے پرائمری اسکول میں کام کرتے دو سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس نے بچّوں کی بہتر تعلیم و تربیت میں کوئی بھی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ بچّے صحیح لکھنا پڑھنا اور بولنا سیکھ گئے تھے۔ ایک روز اس نے بھوشن لال کو کہا:

"سر آپ کل اسکول کمیٹی ممبران کو اسکول میں بلوائیے میں اپنی ماہانہ پروگریس رپورٹوں پہ ان کے دستخط کروانا چاہتی ہوں تاکہ میری تنخواہ نکل سکے۔"

بھوشن لال نے کہا "ٹھیک ہے میں کل انہیں اسکول میں بلواتا ہوں"

دوسرے دن سرپنچ اور اسکول کمیٹی ممبران میں سے صرف تین اسکول پہنچ گئے۔ فقیر چند نام کا ممبر کسی وجہ سے نہیں پہنچ پایا تھا۔ سب نے دستخط کئے اور ذلفاں بی بی اور بھوشن لال کو بجلی پانی، اور سڑک کی منظور شدہ درخواستوں کے لئے مبارک باد دی۔ پھر جب وہ ایک دن خود اپنے اسکول کے بچّے کو ساتھ لے کر فقیر چند کے گھر دستخط کروانے گئی تو فقیر چند شراب پی بیٹھا تھا۔ اس نے خمار آلود آنکھوں سے پہلے تو ذلفاں بی بی کے گل اندام پہ نظر دوڑائی پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی پروگریس رپورٹوں پہ دستخط کئے۔ ذلفاں بی بی کے ذہن و دل کے کسی گوشے سے یہ آواز ابھری کہ اس کے آبائی گاؤں میں ایک نہیں کئی

راون موجود ہیں۔

ایک بار ذلفاں بی بی گاؤں سے شہر اپنے والدین کے پاس جا رہی تھی وہ اکیلی جنگل کے راستے سے گزر رہی تھی کہ اچانک اسے ڈھول باجے کی آواز سنائی دی۔ یہ اس کے اپنے گاؤں کی برات کسی دوسرے گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ دلہا گھوڑے پہ سوار تھا اور براتی اودھم مچاتے ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ اوباش قسم کے نوجوان ڈھول بجانے والوں کے ساتھ آگے آگے ناچ رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ نوجوان حال ہی میں جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ چکے ہیں۔ ذلفاں بی بی ڈری سہمی، شرماتی، لجاتی آہستہ سے راستے سے پرے ہٹ کے ان ہلڑ بازی مچانے والے لڑکوں کی نظروں سے دور آگے نکل گئی تو ان اوباش لڑکوں میں سے ایک نے پیچھے سے اس پر فقرہ کسا ''او سوہنئے مار سٹیا'' اور زور سے سیٹی بجائی۔ دوسرے نے کہا ''اوئے کالجہ کڈ کے لے گئی'' پھر ان چاروں نے پے در پے سیٹیاں بجانا شروع کر دیں۔ ذلفاں بی بی نے اُترائی کی طرف تیزی سے قدم بڑھائے۔ وہ ان شیطانوں سے بچنے کے لئے اپنے مالک حقیقی سے دل ہی دل میں دعا کرنے لگی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جب وہ نیچے سڑک پر پہنچی اور منی بس میں سوار ہوئی تو اسے اطمینان قلب نصیب ہوا۔ گھر پہنچ کر اسے دیکھ کر والدین اور بھائی بہن بہت خوش ہوئے۔ ماں بولی

''بیٹی! تجھ پہ واری جاؤں! آج ہی رات کو خواب میں آئی تھی۔'' دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئیں۔ امان اللہ نے پوچھا

''بیٹی کیسی ہو خوش رہی نا؟''

ذلفاں بی بی نے کہا

''ہاں پاپا خدا کے فضل سے ابھی تک تو خوش و خرم ہوں۔ بس آپ والدین کی نیک دعاؤں کی مجھے اشد ضرورت ہے۔''

رات کو جب سب کھانا کھا رہے تھے تو امان اللہ نے ذلفاں بی بی کو کہا ''بیٹی! کے اے ایس کے لئے فارم بھرے جا رہے ہیں تم بھی فارم بھر لو۔''

ذلفاں بی بی متعجب ہو کر بولی

''پاپا! کے اے ایس کرنا کوئی بچوں کا کھیل تھوڑی ہے میں کے اے

ایس نہیں کر پاؤں گی۔"

امان اللہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا

"سنو بیٹی! تم اگر محنت کروگی تو ہر حال میں کے اے ایس کا امتحان پاس کرلوگی، بشرطیکہ تم محنت کرو، اور پھر میری یہ بات بھی یاد رکھو کہ ہر نیا دن آدمی کے لئے اس کا اچھا یا برا مقدر لے کر آتا ہے۔"

باپ کے اصرار پر ذلفاں بی بی نے کے اے ایس کا فارم بھر دیا۔ اس نے کے اے ایس سے متعلق تمام کتابیں خریدیں۔ انہیں دن رات پڑھتی رہی۔ اسکول میں ڈیوٹی دینے کے بعد وہ رات کو دیر تک پڑھتی رہتی۔ البتہ کچھ دن سے اس کے بستر میں پیسوؤں کے دخول سے اسے بڑی بے آرامی ہو رہی تھی۔ وہ جونہی سوتی تو اسے اپنے مخملیں وجود پہ سرسراہٹ سی محسوس ہوتی۔ پھر جس دن اس نے پورے کمرے میں کیڑے مار دوائی کا چھڑکاؤ کیا تو اس رات اسے کسی حد تک آرام کی نیند پڑی۔ صبح جب اس کی آنکھیں کھلیں تو دھوپ آنگن میں اتر آئی تھی۔ اسے اپنی نماز فجر کے قضا ہو جانے کا احساس ہوا۔ وہ اٹھی اور چائے ناشتہ تیار کرنے میں لگ گئی۔ اس کے بعد اسکول چلی گئی۔ اسکول میں حسب معمول اس نے پرارتھنا کے بعد بچّوں کی صحت، صفائی اور ان کی وردی کے علاوہ وقت کی پابندی پر خصوصی لیکچر دیا۔ اس کے بعد جب بچّے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے تو اس نے حاضری رجسٹر اٹھایا اور پانچویں کلاس میں پڑھانے چلی گئی۔ کلاس میں ایک لڑکے کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ زور زور سے رو رہا تھا۔ ذلفاں بی بی اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس لڑکے کو چیت رام نمبردار کے لڑکے نے کلاس میں آتے وقت زور سے دھکا مارا تھا جس کی وجہ سے وہ دیوار کے ساتھ ٹکرا گیا تھا۔ زخمی لڑکے کو مرہم پٹی کرنے کے لئے اسکول آفس میں لے جایا گیا۔ نمبردار کے لڑکے کو ذلفاں بی بی نے اپنے قریب بلایا، اسے پوچھ تاچھ کرنے کے بعد قصوروار پایا اور اسے خوب پیٹا۔ لڑکے نے زور زور سے رونا شروع کیا اور پھر اپنا بستہ اٹھا کر گھر بھاگ گیا۔ گھر میں ماں باپ سے ذلفاں بی بی کی شکایت کی۔ اپنی سُرین پہ پڑے ڈنڈے کا نشان انہیں دکھایا۔ اس کے ماں باپ آگ بگولہ ہو گئے۔ چیت رام اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر اسکول پہنچا اور بھوشن لال کے سامنے آ کر کہنے لگا۔

"یہ اسکول ہے یا پولیس تھانہ میرے اس بیٹے کو دیکھئے میڈم نے کتنی بے دردی سے پیٹا ہے۔" نمبردار نے اپنے بیٹے کی سرین پہ پڑا ڈنڈے کا نشان بھوشن لال کو دکھایا اور کہنے لگا۔

"آپ میڈم کو یہاں میرے سامنے بلائیے۔ یہ میڈم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ ہم نے بچّے اسکول پڑھوانے کے لئے بھیجے ہیں مروانے کے لئے نہیں۔"

بھوشن لال نے ذلفاں بی بی کو اسکول آفس میں بلوایا وہ آئی اور نمبردار نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میڈم آپ نے میرے اس بیٹے کو بڑی بے دردی سے مارا ہے، بچّے شرارتیں کرتے رہتے ہیں پھر کیا ہوا تھا آپ کی یہ وحشیانہ حرکت آپ کو نقصان پہنچائے گی۔"

ذلفاں بی بی نے جواب دیا

"نمبردار صاحب، آپ کا بیٹا بہت زیادہ شرارتی ہے۔ اس نے ایک لڑکے کو لہولہان کر دیا تھا۔ آپ بھی اپنے بیٹے کو سمجھائیے کہ اسکول میں شرارتیں نہ کرے۔"

نمبردار نے کہا

"میڈم آپ ابھی نئی نئی ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ قانونی طور پر ایک ٹیچر بچّوں کو مار پیٹ نہیں سکتا۔ اس لئے بچّوں کو مارنے پیٹنے سے باز آجایئے ورنہ بہت برا ہوگا۔"

بھوشن لال نے منت سماجت کر کے معاملے کو رفع دفع کر دیا۔ ذلفاں بی بی چیت رام نمبردار کے ناشائستہ رویہ پہ کافی شرمسار ہوئی۔ اس نے صبر وتحمل کا دامن تھامے رکھا وہ اپنے معمولات کے مطابق کام کرتی رہی۔ چیت رام نمبردار نے خفیہ طور پر ذلفاں بی بی کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کے خلاف چیف ایجوکیشن دفتر میں جا کر شکایتیں کرتا کہ میڈم اسکول سے غیر حاضر رہتی ہے کبھی یہ شکایت کرتا کہ وہ ٹیچرز فورم کی میٹنگیں کرتی رہتی

ہے۔ غرضیکہ اس نے ذلفاں بی بی کو ہر طرح سے پریشان کرنے میں پورا زور صرف کر دیا۔ ذلفاں بی بی کے خلاف کبھی زونل ایجوکیشن آفیسر اور کبھی چیف ایجوکیشن آفیسر انکوائری کی نوٹس جاری کرتا۔

ذلفاں بی بی اس دن بہت خوش ہوئی تھی جس دن اس نے کے اے ایس کا پہلا امتحان پاس کیا تھا اور بعد میں جب اس نے دوسرا امتحان بھی پاس کر لیا تو اس کی نگاہیں بے ساختہ طور پر خدا کا شکر بجا لانے کے لئے آسمان کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ اب بحیثیت رہبر تعلیم اس کے پانچ سال پورے ہونے میں کل دو ماہ باقی رہ گئے تھے۔ انہی دو مہینوں کے دوران اس نے کے اے ایس کا انٹرویو بھی دے دیا۔ دو مہینے کے بعد جب اخبار میں اس نے کے اے ایس کے کامیاب امیدواروں کی لسٹ میں اپنا نام پڑھا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی کے اے ایس کر چکی ہے۔ اس کے والدین، بھائی بہنیں، اس کے خاندان والے اور اس کی سہیلیوں نے اس کی کامیابی پر بہت زیادہ خوشی منائی تھی۔ ادھر ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن نے بھی ان رہبر تعلیم ٹیچروں کی لسٹ اخبار میں شائع کرادی تھی جن کے پانچ سال مکمل ہو چکے تھے۔ ان میں ذلفاں بی بی کا نام بھی سر فہرست تھا پھر جس دن وہ اپنے آبائی گاؤں کے پرائمری اسکول سے رخصت ہوئی تھی تو گاؤں کے سرپنچ، پنچ، اسکول کمیٹی ممبران، ترلوچن سنگھ، غفار چودھری ان کے اہل خانہ اسکول میں آئے تھے۔ سب سے پہلے بھوشن لال سینئر ٹیچر نے ذلفاں بی بی کو مبارک باد دیتے ہوئے اسے ایک ذہین، محنتی اور خوش نصیب لڑکی قرار دیا۔ اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا پھر غفار چودھری اور ترلوچن سنگھ نے بھی پھول مالائیں پہنائیں۔ جب یہ سبھی لوگ ذلفاں بی بی کو رخصت کرنے لگے تو چیت رام نمبردار بھی کہیں سے آ گیا۔ اس نے آتے ہی ذلفاں بی بی کے پیر چھو لئے اور کہنے لگا:

"میڈم! بھگوان کے لئے مجھے معاف کر دیجئے آپ تو دیوی کا روپ ہیں۔ میں مورکھ آپ کو پہلے پہچان نہیں پایا تھا۔ چیت رام نمبردار کی آنکھیں احساس ندامت سے اشکبار تھیں اور ادھر ذلفاں بی بی کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو لرزاں تھے۔

■❖■

ایک اہم سوال

بدرالدّین کو ایک اونچے عہدے سے سبکدوش ہوئے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ رشوت کیسے لی جاتی ہے اور کیسے دی جاتی ہے یا پھر سرکاری رقومات کو کیسے آگے پیچھے کیا جاتا ہے کہ ہیرا پھیری کرنے والا بری الذّمہ ٹھہرے۔ اس تمام دھاندلی سے وہ بخوبی واقف ہیں، مزید یہ کہ وہ رشوت خوری کو مالِ غنیمت تصور کرتے ہیں۔ ان کی اہلیہ زیب النّساء ایک ہائر سکینڈری اسکول کی پرنسپل ہیں۔ خدا نے انہیں ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازہ ہے۔ بیٹا سول انجینئرنگ کا کورس مکمل کرنے والا ہے جب کہ بیٹی کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رہی ہے۔ دونوں اپنے ماں باپ اور وطن سے دور ہیں۔ بدرالدّین کا حویلی نما مکان شہر کے ایک کنارے پر واقع ہے۔ ایک روز بدرالدّین اور ان کی اہلیہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے ہاں شادی میں گئے تھے۔ جنوری کا مہینہ تھا، چھوٹے دن اور طویل راتیں۔ زیب النساء آدھی رات تک شادی میں شوخ و چنچل حسیناؤں کے ساتھ خوب ہنسی مذاق کرتی رہی۔ اپنی سکھی سہیلیوں کے ساتھ خوب ناچتی گاتی رہی اور بالآخر تھک ہار کر سو گئی جب کہ بدرالدّین رات کو دیر تک اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ اپنی گزشتہ زندگی کے بہت سے واقعات کو بیان کرتے رہے۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد بدرالدّین اور زیب النساء اپنے مکان کا دروازہ کھولنے کے بعد اندر داخل ہوئے تو گھر کی ہر چیز میں بے ترتیبی اور اتھل پتھل دیکھ کر ان کے چہروں کا رنگ فق ہو گیا۔ مکان کی پہلی منزل سے لے کر تیسری منزل تک تمام کمروں کی الماریاں کھلی ہوئی اور اٹیچیاں یہاں وہاں پڑی ہوئی تھیں۔ بدرالدّین فوراً اُس الماری کی طرف دوڑے جس میں انہوں نے نیا مکان خریدنے کے لئے پچیس

لاکھ روپے رکھے تھے اور اُن کی بیوی اپنے سنگھار بکس میں رکھے زیورات کی طرف لپکی۔ زیورات کا بکس نہ پا کر وہ پاگلوں کی طرح مکان کے باہر صحن میں آئی اور زور زور سے چیختی ہوئی کہنے لگی۔

''ہاں میں لُٹ گئی! ہائے میرا سب کچھ مجھ سے چھن گیا''۔

پڑوسیوں نے اس کی دلدوز چیخیں سنیں تو مرد و عورتیں دوڑتے بھاگتے بدرالدّین کے مکان میں آ پہنچے۔ بدرالدّین پر غشی طاری تھی اور زیب النساء اپنی چھاتی اور سر پیٹ رہی تھیں۔ پڑوسیوں کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ رات کو چور مکان کے پچھواڑے کی طرف لگی کھڑکی کا گرل نکال کر مکان کے اندر گھسے ہیں اور پچیس لاکھ اور تقریباً دو لاکھ روپے کے زیورات چُرا کر لے گئے ہیں۔ زیب النساء کو سونے کے کنگن، کانوں کے جھمکے، انگوٹھیاں اور گلے کا ہار بار بار یاد آ رہا تھا۔ اُس نے روتے روتے اپنا بُرا حال بنا رکھا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بدرالدّین کے مکان میں گرد و نواح سے آئے مردوں عورتوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ان کے گھر سے کسی کا جنازہ نکلنے والا ہو۔ باہر سے اندر آنے والا ہر شخص بدرالدّین کو ہمت و حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتا۔ چند لمحوں کے بعد اُن کے دیرینہ دوست مکھن لال بھی اُن کے پاس آ پہنچے۔ انہوں نے بھی اظہارِ تاسف کیا اور بدرالدّین کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''آپ جہاں دیدہ آدمی ہیں، بھگوان پر بھروسہ رکھئے۔ اس صدمہ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اصل میں بھگوان ہی سب کچھ کراتا ہے''۔

دوسرا ایک شخص بولا: ''دیکھئے آپ اس قدر مایوس نہ ہوں جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے خدا کی مرضی کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہلتا، اس لئے ہمت و حوصلے سے کام لیں''۔

بدرالدّین کی آنکھیں پُرنم تھیں اُن کے آس پاس اُن کے دوست واحباب اور رشتے دار بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی مجمع میں افتخار عالم بھی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ حال میں ہی عالمیت کی سند لے کے آئے تھے۔ پورے بارہ برس کے بعد انہیں عالمیت کی سند حاصل ہوئی تھی۔ وہ دینی اور دنیوی علوم سے کماحقہ واقف تھے ''سب کچھ خدا ہی کرتا ہے'' یہ جملہ سنتے سنتے اُن کے کان اب سُن ہو رہے تھے۔ ان کا شکن آلود چہرہ یہ ظاہر

کررہا تھا کہ اُن کے دل میں کوئی خاص بات ہے جو انہیں ناگوار ہورہی ہے۔ بالآخر اُن سے رہا نہیں گیا وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور بآواز بلند بول اٹھے:

''خواتین وحضرات! آپ میں سے تقریباً بہت سے افراد کا یہی کہنا ہے کہ سب کچھ خدا ہی کرواتا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں دن رات میں جو کروڑوں ٹن شراب پی جاتی ہے، لاکھوں زنا کے اڈے قائم ہیں۔ اس کے علاوہ رشوت، ظلم واستحصال، چیزوں میں ملاوٹ، ہیرا پھیری، دھوکہ وفریب، حق تلفی، ڈاکہ زنی ،غنڈہ گردی، شکم مادر میں بیٹیوں کا قتل، حقوق اللہ اور حقوق العباد سے چشم پوشی غرضیکہ یہ سب کچھ کیا خدا کرواتا ہے؟ میں آپ سے اس اہم سوال کا جواب چاہتا ہوں؟''

افتخار عالم کی پُر جوش باتیں سن کر تمام مجمع پر سکوت طاری ہوگیا۔ سب کی نظریں جھک گئیں۔ ان لوگوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لمحہ بھر کی خموشی کے بعد بدرالدّین نے آہستہ سے اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اور ہمت جتاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور افتخار عالم سے کہنے لگے:

''افتخار میاں! میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلئے۔ میں چوروں کے خلاف رپٹ لکھوانا چاہتا ہوں!''

■❖■

چُھپا سانپ

پنڈت رتن شاستری کی وضع قطع اور رفتار و گفتار ہی کچھ ایسی تھی کہ اپنے اور پرائے انہیں بھگوان کا روپ سمجھتے تھے۔ انہیں نہ صرف گیتا اور رامائن کا گیان تھا بلکہ چاروں وید بھی پڑھ ڈالے تھے۔ کاشی میں دھارمک تعلیم حاصل کی تھی۔ شاستری بھی تھے کئی منتر اور بھجن انہیں زبانی یاد تھے۔ جنم مرن کے موقع پر لوگ انہیں بڑے ادب واحترام کے ساتھ بلاتے۔ سفید رنگ کی دھوتی اور کرتہ ان کی خاص پسند تھی۔ ماتھے پہ چندن کا تلک لگائے بغیر نہ رہتے۔ سر منڈواتے لیکن بودی بڑھانے کے شوقین تھے۔ پیروں میں چمڑے کا بوٹ یا چپل پہننا مہا پاپ سمجھتے، اس لئے کھڑاؤں پہنتے تھے۔ شادی بیاہوں میں لوگ انہیں کافی عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے۔ انہیں کھانے پینے کی لذیذ اور طاقتور چیزیں کھلاتے تھے جس کی وجہ سے ان کا جسم سرتاپا گرم رہتا اور بعض اوقات ان میں کام واسنا کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی حالانکہ دو بیٹوں اور چار بیٹیوں کے باپ تھے۔ سب بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ بڑا بیٹا منوہر شرما محکمہ صحت میں تیسرے درجہ کا ملازم تھا اور چھوٹا بیٹا راجن گونگا تھا وہ بالکل کچھ بھی نہیں بول پاتا تھا۔ بس ہاتھ کے اشاروں سے اپنے من کی بات سمجھاتا۔ رتن شاستری کی بیوی کملیش کماری اب تقریباً بڑھاپے کی اور بڑھ رہی تھی اس کے تمام بدن کے جوڑوں میں درد رہتا تھا۔ حسن کے آثار مٹ چکے تھے۔ اسے اپنا اور پنڈت رتن شاستری کا وجود ایک بوجھ سا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا بوجھ جسے اٹھانے کی اب اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔ بڑی مشکل سے گھر کا کام کاج کرتی تھی لیکن پنڈت رتن شاستری جوان تو نہیں تھے البتہ بوڑھے بھی نہیں تھے۔ جسمانی خدوخال بھی کوئی خاص پر کشش نہیں تھے مگر کسی بھی جوان ناری پہ

جونہی ان کی نظر پڑتی تو دیر تک اسے دیکھتے ہی رہتے۔ تب ان کے شریر کی پانچوں اندریوں میں کلبلاہٹ سی پیدا ہونے لگتی۔ اس صورت میں وہ اپنے آپ کو بے قابو سا محسوس کرنے لگتے مگر کیا کرتے، کہاں جاتے۔ اوپر سے اچ کوٹی کے پنڈت، سفید دھوتی کا جھول جال، تلک دھاری، ہاتھ میں کیسری رنگ کی مالا اور ہر وقت پوتھی پتروں کی چھوٹی سی بقچی اٹھائے اس بات کے لئے بھی مشہور تھے کہ وہ جادو ٹونا، گنڈے تعویذ کھلانے اور کھوٹ کرنے والوں کا پتہ لگانے میں بڑے ماہر ہیں اس لئے طرح طرح کے روگی اور سحر زدہ لوگوں کا ان کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ روگیوں کو جھوٹی تسلیاں دیتے ہاتھ کی لکیروں میں انہیں نا معلوم کیا کیا نظر آتا تھا۔ پھر وہ روگی کے چہرے کے تاثرات جاننے کے بعد اسے الٹی سیدھی باتیں سناتے اور صحت یاب ہونے کا یقین دلاتے ہوئے سو پچاس روپے کا نوٹ حاصل کر لیتے۔ مختلف طرح کے پاکھنڈ کرتے کرتے وہ عوام میں کافی مشہور و مقبول ہو چکے تھے۔ سرمایہ بھی اچھا خاصا اکٹھا کر لیا تھا من کی واسنا بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ادھر ان کا بیٹا منوہر شرما اسپتال میں نئے نئے گل کھلا رہا تھا۔ وہ اس قدر بدمزاج اور بدکردار تھا کہ اسپتال میں آنے والی جوان عورتوں اور لڑکیوں کو انجکشن کے بہانے استعمال کر لیتا تھا۔ عورتیں اور جوان لڑکیاں بدنامی اور بے عزتی کے خوف سے چپ سادھ لیتیں۔ منوہر شرما حالانکہ شادی شدہ اور تین سال کی بچّی کا باپ تھا اس کی شادی کو چار برس ہو چکے تھے۔ اس کی بیوی میناکشی انتہائی حسین تھی۔ بوٹا قد، لمبیری گھنیری سیاہ زلفیں، بڑی بڑی آنکھیں، دمکتے بھرے بھرے رخسار، موتیوں کی لڑی ایسے دانت، گلاب کی پنکھڑی ایسے ہونٹ، ستواں ناک، صراحی دار گردن، مخروطی انگلیاں، جھلمل کرتی ہری چوڑیاں، اس کا تھل تھل کرتا وجود نہایت دلکش تھا۔ اتنی خوبصورت پتنی ہونے کے باوجود منوہر شرما کی نظریں بہک گئی تھیں اور وہ اپنے محکمے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے حرام کاری میں مبتلا تھا۔

پنڈت رتن شاستری کی بیوی کملیش کماری اکثر بیمار رہتی تھی۔ بدن کے جوڑوں کے درد کی وجہ سے زیادہ تر بستر پر پڑی رہتی۔ کروٹ بدلتی تو ہائے مری! اف" کی آوازیں اس کے منہ سے نکلتیں۔ تقریباً دو مہینے سے اس نے بستر پکڑ لیا تھا۔ میناکشی ایک اچھی بہو کی حیثیت سے اپنی ساس اور سسر کی خدمت کرتی تھی۔ چائے پانی، کھانا اور وقت پر ساس کو

دوائی کھلانا وہ اپنا اہم فرض سمجھتی تھی۔ میناکشی جب سے اس گھر میں آئی تھی تب سے یہ گھر بارونق اور خوشحال ہو گیا تھا۔ اتنی اچھی بہو جو خوبصورت تو تھی ہی خوب سیرت بھی تھی اپنے پتی کا خاص خیال رکھتی تھی مگر پتی کو اس کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اتنی سندر ناری سے جیسے وہ اوب گیا تھا اور باہر منہ مارنا اس نے نہ جانے کب سے سیکھ لیا تھا۔

رات کی تاریکی اور تنہائی میں جب پنڈت رتن شاستری بیوی کے بغیر اداس ہونے لگتے تو وہ اپنے بستر سے اٹھ کر دھیرے دھیرے بیوی کے پاس آجاتے اور جونہی لیٹنے لگتے تو ان کی بیوی کملیش کماری درد کی ماری چیخ پڑتی۔ پنڈت رتن شاستری کی چھاتی پہ جیسے سانپ لوٹ جاتا۔ تب انہیں بیوی کی بیماری پہ بہت غصہ آتا اور ایک ٹھنڈا سا وجود لے کر واپس اپنے بستر پہ چلے جاتے۔ انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے بدن میں سناٹا سا چھا گیا ہو۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ وہ بڑے شوق سے اپنی دھرم پتنی کے پاس جاتے اور مایوس ہو کر پھر اپنے بستر پر چلے آتے! آدھ درجن اولاد ہونے کے باوجود ان کی جنسی ہوس کا گھوڑا ابھی تک کمزور نہیں ہوا تھا۔

ایک روز پنڈت رتن شاستری کی بیوی کملیش کماری اپنے میکے چلی گئی تھی۔ ان کا بڑا بیٹا منوہر اپنی ڈیوٹی پہ چلا گیا۔ گھر میں صرف ان کی بہو میناکشی، اس کی بچّی منیا اور گونگا راجن تھے۔ گرمیوں کے دن تھے میناکشی نے اپنی بچّی کو کھانا کھلانے کے بعد سلا دیا تھا اور راجن بھی ایک الگ کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ میناکشی نے دوپہر کا کھانا کھایا کچھ ہی وقت کے بعد بیٹھے بیٹھے اس پہ نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔ پنڈت جی اپنے بستر پہ لیٹے ہوئے تھے لیکن نیند ان کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ تنہائی ان کو ڈس رہی تھی ان کا ذہن بار بار ناری ملاپ کی طرف دوڑ جاتا اور دل کی بے قراری کو کسی طرح بھی قرار نہیں آرہا تھا۔ جب ان کا منہ سوکھنے لگا اور پورے بدن میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تو انہوں نے بہو کو آواز دی۔

"بہورانی! میں پانی پینا چاہتا ہوں، میرا منہ سوکھ رہا ہے۔"

میناکشی جو کچھ ہی دیر پہلے چند لمحے آرام کرنے کے لئے بستر پہ لیٹی ہوئی تھی اپنے سسر کی آواز سنتے ہی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی، گلاس میں پانی انڈیلا اور گھونگھٹ کاڑھے شرماتی لجاتی سسر کو پانی پلانے اس کے کمرے میں چلی گئی۔

پنڈت رتن شاستری نے جونہی بہو کی پازیب کی جھنکار سنی تو فوراً بستر پہ اٹھ بیٹھے۔ میناکشی نے جونہی پانی کا گلاس اپنے سسر کی طرف بڑھایا تو سسر جی اس کے پری پیکر وجود کو دیکھ کر لٹو ہو گئے۔ انہیں اپنا تمام دھارمک فلسفہ، اپنے ماتھے کا تلک چھاپا اور مقام ومرتبہ سب کچھ بھول گیا۔ انہوں نے فوراً میناکشی کی گوری کلائی پکڑلی اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہنے لگے۔

''بہورانی! میری طرف دیکھو، آخر کب تک تم اس چاند سے مکھڑے کو مجھ سے چھپاتی رہوگی۔ جب سے اس گھر میں آئی ہو ایک بار بھی تمہارا چہرہ نہیں دیکھا ہوں۔ میرا من تمہارے لئے ترس رہا ہے اور تم بھاگی جارہی ہو بھگوان کے لئے ایسا نہ کرو۔''

میناکشی نے اپنی کلائی چھڑانے کی بھرپور کوشش کی مگر اس کے سسر کی گرفت کافی مضبوط تھی۔ وہ ایک فاختہ کی مانند دام صیاد میں پھڑ پھڑاتی رہی اور بغیر کچھ کہے پوری کوشش کر رہی تھی کہ وہ اپنے سسر کی گرفت سے آزاد ہو مگر اس کا چھوئی موئی سا وجود اب کافی حد تک ٹوٹنے بکھرنے لگا تھا۔ تب اس نے اپنے سسر کو کہا۔

''آپ میرے پتا جی کے سمان ہیں، ایسا نہ کیجئے کیا اس گھور پاپ کے بعد میں آپ کی بہو کہلانے کے لائق رہوں گی؟''

لیکن پنڈت رتن شاستری پر حیوانیت کا بھوت سوار ہو چکا تھا ان کی جنسی ہوس انہیں ایک گہرے کنویں میں دھکیل چکی تھی کہ جہاں سے باہر نکلنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ میناکشی تڑپتی رہی، لرزتی رہی، سسکتی رہی، بار بار مدافعت کے لئے ہاتھ پیر مارتی رہی اپنے سسر کو بھگوان کا واسطہ دیتی رہی لیکن کچھ ہی لمحوں میں اس کا سسر اس کی عزت وعصمت لوٹ کے الگ ہو گیا۔

میناکشی اپنے سسر کے ہاتھوں لٹ چکی تھی۔ وہ آنسو پیتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف آنے لگی تو پنڈت رتن شاستری بولے۔

''ادھر دیکھو بہورانی! جنہیں پریم روگ لگ جاتا ہے وہ ایک طرح کے اندھے ہو جاتے ہیں جو کچھ ہوا اسے اپنے سینے میں دفن رکھنا اس کا ہرگز کسی سے ذکر نہ کرنا ورنہ ہم دونوں کسی کو منہ دکھانے کے لائق

نہیں رہیں گے۔

مینا کشی اپنے کمرے میں آئی۔ اس کی تین سالہ مُنیا گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ میناکشی نے جو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا وہ آج اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اپنی معصوم بچّی کا چہرہ تکتی رہی، پھپھک پھپھک کر روتی رہی، اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہ غم وغصے کے جوار بھاٹا میں بہت کچھ سوچتی رہی۔ اسے اپنے روپ سروپ سے نفرت سی ہو رہی تھی۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے سوچ کے مختلف دائرے اسے پریشان کئے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا وہ اپنے میکے بھاگ جائے اپنی ماں سے اس بھیانک واقعے کا ذکر کرے لیکن فوراً اسے اپنے والدّین اور خاندان والوں کی عزت کا خیال آیا اس لئے اس نے یہ قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر اپنے پتی سے اس واقعے کا تذکرہ کرے گی تو وہ اپنے باپ کی اس کالی کرتوت پر بالکل یقین نہیں کرے گا وہ یہی سمجھے گا کہ میری پتنی مجھے اپنے ماتا پتا سے الگ کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے ان پہ الزام تراشی کر رہی ہے اور اگر پاس پڑوس کی کسی عورت سے اپنا یہ حال بیان کرے گی تو پورے شہر میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی۔ جیتے جی اس کی زندگی نرک بن جائے گی۔ بدنامی کا طوق جب اس کے گلے میں پڑ جائے گا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی۔ بالآخر وہ سوچتے سوچتے اس فیصلے پر پہنچی کہ وہ آتم ہتیا کرے مگر اچانک اس کی نظر اپنی پیاری بچّی منیا پہ پڑی جسے فرشتے نیند کے عالم میں گدگدی کر کے مسکرانے پر مجبور کر رہے تھے۔ میناکشی کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں اپنی بچّی کی ممتا چھلک پڑی۔ اسی کے ساتھ اسے یہ بھی خیال آتا کہ آتم ہتیا کرنے والے کو بھگوان کبھی معاف نہیں کرتا۔ جب اسے سوچتے سوچتے ذہن کے صحرا میں چاروں طرف مہیب سیاہ بادل چھائے معلوم ہوئے تو اس نے صبر کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ معمول کے مطابق گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ اس نے کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی عظیم صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ عورت دنیا میں کتنی مجبور اور مظلوم رہی ہے اسے اس کا پورا اندازہ ہو چکا تھا۔

تقریباً ایک ہفتے کے بعد پنڈت رتن شاستری نے پھر انگڑائی لینا شروع کر دی۔ اب کی باران کی بیوی کملیش کماری اپنے بیٹے منوہر کے ہمراہ اسپتال گئی ہوئی تھی اور گونگا

راجن بازار گھومنے چلا گیا تھا۔ گھر میں میناکشی اپنے کمرے میں بیٹھی اپنی بچّی منیا کو لوری سنا کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی تا کہ وہ ایک طرف ہو کر گھر کا کام کاج اطمینان سے کر سکے۔ مُنیا کی فرمائش اور اس کی ضد اسے کوئی بھی کام کرنے نہیں دیتی تھی ہلکی ہلکی تھپکیاں اور میٹھی میٹھی لوری سنتے سنتے تھوڑی کے بعد منیا سو گئی۔ میناکشی اٹھی اور کمرے میں ہر چیز کو سلیقے سے ترتیب دینے لگی۔ اس نے صوفہ سیٹوں پر چڑھے میلے کور اتارے گھر والے کے میلے کپڑے اٹھائے اور کپڑے دھونے والی مشین میں ڈال آئی۔ وہ جونہی واپس اپنے کمرے میں آئی اسی وقت پنڈت رتن شاستری بھی ہانپتے کانپتے اس کے کمرے میں آپہنچے۔ میناکشی نے اپنے راون صفت سسر کو دیکھ کر فوراً گھونگھٹ میں اپنا چہرہ چھپالیا اور ڈری سہمی ہوئی جونہی کمرے سے باہر جانے لگی تو پنڈت رتن شاستری دروازے پر کھڑے ہو گئے اور میناکشی کو کہنے لگے:

''بہو رانی! تمہارے بغیر اب مجھے گھر میں رہا نہیں جاتا۔ من بھاری ہونے لگتا ہے اک اگنی سی ہر طرف شریر میں جلتی رہتی ہے۔ میں کہاں جاؤں کیا کروں؟ تمہاری ساس بیمار رہتی ہے مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے کوئی ان دیکھی شکستی مجھے تمہاری اور دھکیل رہی ہے۔ بہو رانی مجھے تمہارے بغیر کچھ بھی نظر نہیں آتا۔''

میناکشی دیر تک اپنے سسر کی گرفت سے چھٹکارا پانے کا جتن کرتی رہی۔ بہت تڑپی، گڑگڑائی مگر سسر کا پتھر دل نہیں پسیجا۔ حیوانیت انسانیت پر غالب آچکی تھی۔ میناکشی ایک بار پھر اپنے سسر کی جنسی ہوس کا نشانہ بنی تھی مگر اب کی بار اس کی حالت ایک بپھری ہوئی شیرنی کی سی تھی۔ اس کے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند ہو چکی تھیں، اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے سنگھاردان کے سامنے پڑے کورے کاغذ اور پین کو اٹھانے کے بعد پولیس آفیسر کے نام ایک خط لکھا جس میں اس نے اس طرح کے الفاظ لکھے:

''ایک دکھیاری کا خط پولیس کے نام!
میں میناکشی شرما پتنی منوہر شرما عمر چوبیس برس بذریعہ خط پولیس کو یہ اطلاع دینا

چاہتی ہوں کہ میرا اسسر پنڈت رتن شاستری دو مرتبہ زبردستی میرے ساتھ منہ کالا کرچکا ہے۔آج سے ایک ہفتہ پہلے جب اس نے میری عزت وعصمت لوٹی تھی تو میں نے بہت سی باتیں سوچ کر صبر کا کڑوا گھونٹ پی لیا تھا لیکن آج پھر اس نے میرے ساتھ منہ کالا کیا ہے۔ اب میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکتی۔ اس لئے میں مجبوراً خودکشی کررہی ہوں۔ میں یہ بات واضح کردینا چاہتی ہوں کہ میری موت کا ذمہ دار میرا اسسر ہے جس نے مجھے خودکشی کرنے پر مجبور کیا۔

دکھیاری میناکشی شرما آج سنساروالوں سے ہمیشہ کے لئے وداع ہورہی ہے۔"

میناکشی نے خط لکھنے کے بعد اسے اچھی طرح سے لفافے میں بند کیا، اپنی شادی پہ خریدی چنری کو سیلنگ فین سے باندھا اور خط کو اپنے گلے کے ساتھ رکھ کر پھندا بنا کر فین کے ساتھ لٹک گئی۔ چند لمحے تڑپی اور اس کے بعد اس کے بدن سے روح جدا ہوگئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور گردن ایک طرف کو مڑ گئی۔ چہرے پہ خون کی سیاہی سی چھا گئی، موت نے زندگی پہ فتح پائی!

منوہر شرما اور اس کی ماں جونہی گھر کے اندر داخل ہوئے تو میناکشی کی لاش سلینگ فین کے ساتھ لٹکی دیکھتے ہی دونوں ماں بیٹے زور سے چیخ پڑے۔ ان کی چیخیں سن کر پنڈت رتن شاستری بھی اپنے کمرے سے باہر آئے اور وہ بھی میناکشی کو دیکھ کے منہ بسورنے لگے۔ منوہر ڈھاریں مار مار کر رو رہا تھا۔ ہمسایوں نے جب ان کی چیخ وپکار سنی تو وہ بھی بھاگتے دوڑتے وہاں پہنچے۔ دیکھتے دیکھتے ایک کہرام سا مچ گیا۔ میناکشی کے میکے والوں کو فوراً یہ اطلاع دی گئی کہ ان کی بیٹی نے خودکشی کرلی ہے لہٰذا آ کے خود اپنی آنکھوں دیکھ لیں۔ چند آدمی پولیس کو اس بھیانک واقعے کی اطلاع دینے چلے گئے۔ اب مُنیا بھی جاگ چکی تھی اور اپنی ماں کے پاؤں سے لپٹی چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ پنڈت رتن شاستری بوکھلائے ہوئے گھر کے اندر باہر پھر رہے تھے۔ منوہر نے روتے روتے اپنا برا حال کردیا تھا۔ وہ میناکشی کی خودکشی پر حیران تھا۔ اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات کبھی نہیں آئی تھی کہ میناکشی ایسا لرزہ خیز کام کرے گی۔ کچھ ہی وقت کے بعد ڈی ایس پی صاحب اپنے سپاہیوں کے ہمراہ پولیس کی گاڑی سے نیچے اترے اور پنڈت رتن شاستری کے گھر میں داخل ہوئے۔ تمام

رشتے دار اور شہر کے لوگ یہاں جمع تھے۔ پولیس نے جب میناکشی کی لاش فرش پہ رکھی اور اس کے گلے میں پڑے پھندے میں ایک خط دیکھا تو سب حیران رہ گئے۔ سپاہی نے اپنے آفیسر کو خط دیا۔

ڈی ایس پی صاحب نے میناکشی کے ہاتھ کا لکھا خط سب کو زور سے پڑھ کر سنایا تو تمام رشتے دار، پاس پڑوس والے اور شہر کے معزز لوگ ششدر رہ گئے۔ ڈی ایس پی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ انہوں نے غصے کی حالت میں سب کے سامنے پنڈت رتن شاستری کو لاتیں اور مکے مار مار کر پولیس کی گاڑی میں بٹھایا اور میناکشی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دیا۔ جب لاش اٹھانے لگے تو منوہر شرما کی تین سالہ بچّی منیا چیخ چیخ کر کہنے لگی ”مجھے میری مماں کے ساتھ لے چلو۔“

■❖■

چہرہ چھپائے لوگ

راج محمد کی اکلوتی بیٹی شہر کے زنانہ کالج میں بی اے سال دوم میں زیر تعلیم ہے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی بہتر تعلیم و تربیت اور اُسکے روشن مستقبل کی فکر میں نہایت سنجیدگی برتی ہے۔ اُنہیں یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اُن کی بیٹی جدید تہذیب کی زہریلی ہواؤں کا شکار ہو کے نہ رہ جائے۔ چونکہ وہ جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ چکی تھی، راج محمد بڑے دور اندیش ہیں، انہوں نے نہایت نرم لہجے میں اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''میری بیٹی! میری نصیحت آمیز باتوں پہ عمل کرنا، بیٹیاں گھروں کی زینت اور رحمت ہوتی ہیں لیکن جب ان کے قدم بہک جاتے ہیں تو ماں باپ کے لئے زحمت اور بدنامی کا باعث بنتی ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں تم علم کی شمع بنو، رونق محفل نہ بنو، تم کالج او ریونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرو لیکن تمہارے رُخ پہ نقاب رہے تاکہ تم پہ کسی غیر محرم کی نگاہ نہ پڑنے پائے''۔

باپ کی باتیں سُن کر بیٹی کے ماتھے پہ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر آئیں تھیں تب اُس نے باپ کو یقین دلاتے ہوئے کہا تھا۔

''پاپا! میں آپ کی باتوں پہ زندگی کے آخری لمحے تک عمل پیرا رہوں گی۔ آپ میری فکر نہ کیجئے گا، جیسا آپ چاہتے ہیں میں ویسا ہی کروں گی''بیٹی کی باتیں سن کر باپ کو اس وقت ذہنی سکون اور اطمینان قلب نصیب ہوا تھا۔

آج راج محمد اپنی بیٹی کے کالج کے گیٹ کے باہر ایک درخت کے سائے میں اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو اپنے دوست کے گھر میں ہو رہی شادی کی

تقریب میں لے جانے کے لئے آئے تھے۔ چھوٹی بڑی گاڑیوں اور لوگوں کی بے ہنگم آوازیں چاروں طرف سے انہیں سنائی دے رہی تھیں وہ نہ معلوم کس گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ اچانک اُن کی نظر موٹر سائیکلوں پہ سوار تین نوجوانوں پہ پڑی، انہوں نے اپنی موٹر سائیکلیں کالج گیٹ کے قریب ہی ایک طرف کھڑی کر دیں۔ تینوں کے چہرے ہشاش بشاش تھے اور ان کی نظریں متلاشی معلوم ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد کالج کے گیٹ سے تین طالبات موبائل فون کان سے لگائے، ہنستی مسکراتی، باہر آئیں اور اپنے اپنے من پسند عاشقوں سے ہنستے مسکراتے باتیں کرنے لگیں۔ ٹی شرٹوں اور زین کی پینٹوں میں ملبوس ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کے راج محمد ششدر سے رہ گئے۔ انہوں نے آسمان کی وسعتوں پہ نظریں دوڑائیں اور پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گئے۔ ان لڑکوں اور لڑکیوں کے چہروں سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پہلی بار آپس میں مل رہے ہوں اور اب وہ یہاں سے نکلنے کے لئے بیتاب تھے۔ وہ اپنوں اور بیگانوں کی نظروں سے دور جانے کے خواہشمند نظر آرہے تھے کسی ایسی جگہ جہاں تنہائی ہو، ایسی جگہ کہ جہاں پہنچ کر وہ ایک دوسرے کے جذبات، احساسات اور نفسیات کو سمجھ سکیں۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ لڑکیاں اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ جب وہ وہاں سے موٹر سائیکلوں پہ سوار ہوں تو انہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ اور اگر کسی کا بھائی، باپ یا کوئی رشتہ دار اُسے کسی اجنبی لڑکے کے ساتھ موٹر سائیکل پہ سوار جاتے دیکھ لے گا تو نہ صرف بڑی بدنامی ہوگی بلکہ پستول اور چھرے تک جسموں پہ استعمال ہوں گے۔ تینوں مشورہ کرنے لگیں اُن میں سے پُونم نے یہ رائے دی کہ "چلو ہم تینوں یہاں سے کچھ دور تک پیدل چلیں اور پھر آگے سے موٹر سائیکلوں پہ سوار ہو جائیں"۔

دوسری لڑکی ہرپریت کور نے اُس کی رائے کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

"پیدل چلتے چلتے تو ہم تھک جائیں گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو جانا چاہئے۔ ماڈرن دور ہے ہمیں اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

تیسری لڑکی فوزیہ بانو سب کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہوئی بولی:

"میری یہ رائے ہے کہ ہم تینوں اپنے اپنے چہرے کو دوپٹے سے

ڈھانپ لیں۔ بس صرف آنکھیں کھلی رکھیں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے ایک یہ کہ ہمیں کوئی بھی پہچان نہیں پائے گا اور دوسری بات یہ کہ ہم شریف گھرانوں کی باعزت اور باحیا لڑکیاں تصور کی جائیں گی۔"

سب نے پُر مسرت لہجے میں اُس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اب تینوں لڑکیاں نقاب پوش سی لگ رہی تھیں، وہ اپنے اپنے بوائے فرینڈ کے ہمراہ موٹر سائیکلوں پر سوار ہو گئیں اور دیکھتے دیکھتے تینوں موٹر سائیکل آہستہ آہستہ مندروں، مسجدوں اور گورودواروں والے اس شہر کی گاڑیوں اور لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے باہر نکلنے لگے۔ راج محمد نے بھی اُن کے پیچھے اپنی گاڑی اسٹارٹ کر دی یہ سوچتے ہوئے کہ دیکھوں آخر یہ کہاں جا رہے ہیں۔ چند ہی لمحوں میں تینوں موٹر سائیکلوں کی رفتار تیز کر دی گئی۔ اب یہ تینوں موٹر سائیکل ایک بڑی کشادہ سڑک پہ ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے جونہی ایک دریا کا پُل پار کیا تو تینوں لڑکیوں نے اپنے اپنے چہروں سے دوپٹے ہٹا دیئے اور خوشی کے مارے چہکنے لگیں۔ پل پار کرنے کے بعد دور آگے قومی شاہراہ کے ایک موڑ پہ انہوں نے اپنے اپنے موٹر سائیکل کھڑے کر دیئے۔ تینوں لڑکیوں نے اپنے اپنے عاشق کا ہاتھ تھاما اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک کالے گھنے جنگل میں چلے گئے۔ راج محمد اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے محوئے حیرت تھے۔ اُن کے ذہن ودل کو بار بار یہ سوال نوچ رہا تھا کہ اس کالے گھنے جنگل میں اب یہ کیا کریں گے؟؟؟؟

■❖■

آنکھوں کی عصمت دری

پنڈت میگھ ناتھ کی عمر اب اکاون برس سے تجاوز کر چکی تھی مگر اب بھی وہ اپنے پتاجی کی اُس مار کو نہیں بھول پائے تھے جو انہوں نے ساتویں جماعت میں کھائی تھی۔ ریتا نام کی ایک لڑکی ان کے ساتھ پڑھتی تھی۔ لڑکی نیچ ذات کی تھی، ایک دن ریتا کی کاپی پر میگھ ناتھ نے ''پیار'' کا لفظ لکھا تھا اور نیچے ساتھ میں نادانی سے اپنا نام بھی لکھ دیا تھا۔ ریتا نہایت شرمیلی اور غیرت مند لڑکی تھی۔ گھر آکر جب وہ پڑھنے لکھنے بیٹھی تو سب سے پہلے جو کاپی اس کے ہاتھ لگی وہ ہندی کی کاپی تھی۔ کاپی کے پہلے اندرونی صفحے پر اس کی نظر لال سیاہی سے لکھے لفظ ''پیار'' پر پڑی تو وہ چونک گئی، نیچے لال سیاہی سے ''میگھ ناتھ'' لکھا ہوا تھا۔ ریتا کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ روتی ہوئی اپنی ماں کے پاس گئی اور اس سے بولی ''اماں! پڑوس کے پنڈتوں کا چھورا میری کاپی پہ پیار کا شبد لکھے ہے۔''

ریتا کی ماں نے کاپی دیکھی تو آگ بگولہ ہوگئی۔ اس نے زور سے دو تین تھپڑ ریتا کے گال پر جھڑ دیئے اور چیختی ہوئی بولی تھی:

''اس رنڈوے کے ہاتھوں میں کیسے تری کاپی پہنچی۔ مجھے بتا؟، ورنہ تیری بوٹی بوٹی کر کے کتوں کو کھلا دوں گی؟''

ریتا گڑگڑاتی ہوئی کہنے لگی تھی:

''اماں مجھے نہیں معلوم اُس نے کب میری کاپی پہ پیار کا شبد لکھا ہے! میں سچ کہتی ہوں، میرا منوا صاف ہے''۔

ریتا کے باپ کو مرے ہوئے آٹھ سال ہو گئے تھے۔ ماں ہی اپنے تین بچوں کی

کفالت میں جُتی ہوئی تھی۔ ریتا سے چھوٹا اس کا ایک بھائی اور ایک تین سال کی بہن تھی۔ ریتا کی ماں کے ہاتھ میں کاپی تھی۔ اس نے ریتا کو بازو سے پکڑا اور تقریباً گھسیٹتی ہوئی اُسے پنڈت شنبھو ناتھ کے گھر لے گئی تھی۔ گھر کے قریب پہنچتے ہی اس نے گھونگھٹ کاڑھا اور بڑے غم و غصے کے ساتھ پنڈت شنبھو ناتھ سے اُس کے بیٹے میگھ ناتھ کی شکایت ان الفاظ میں کی تھی:

''پنڈت جی! آپ کے بیٹے نے میری بٹیا کی کاپی پر ''پیار'' کا شبد لکھا ہے، اگر آپ جیسے مہان لوگوں کے بیٹے اتنی چھوٹی عمر میں بہکنے لگیں تو عام لوگوں کے بچّوں کا کیا حال ہوگا؟''

پنڈت شنبھو ناتھ اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھے اپنے کنبے کے افراد کے ساتھ کچھ ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔ ریتا کی ماں کی باتیں سن کر وہ ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے پاؤں تلے جیسے زمین کھسکتی جا رہی تھی۔ اپنے کانوں پہ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے میگھ ناتھ کی شکایت سن رہے ہوں۔ پنڈت شنبھو ناتھ مانے ہوئے پنڈت تھے، ہر کوئی ان کی عزت کرتا تھا، بیاہ اور جنم مرن کے موقعے پر لوگ انہیں بڑی عقیدت سے بلاتے تھے، مگر آج انہیں ریتا جیسی نیچ ذات کی لڑکی کی ماں جو کچھ سنا رہی تھی، اسے وہ کن کانوں سے سن رہے تھے، یہ وہی جانتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ریتا کی ماں نے ان کے ہاتھ میں کاپی دیتے ہوئے کہا تھا:

''یہ دیکھئے آپ کا بیٹا میری بیٹی سے کیا چاہتا ہے۔ پنڈت جی ہم بھلے ہی نیچ ذات کے لوگ ہیں لیکن اتنے گرے ہوئے نہیں ہیں کہ اپنی عزت کا خیال ہی نہ رکھیں''۔

ریتا کی ماں کی باتیں پنڈت شنبھو ناتھ کے دل کو چھلنی کر گئی تھیں انہوں نے ریتا کی ماں کو کہا تھا:

''ذرا دھیرج رکھیے، سب کچھ آپ کے سامنے ہوگا'' یہ کہتے ہوئے پنڈت شنبھو ناتھ ایک دم اپنے بیٹے میگھ ناتھ پر اس طرح جھپٹ پڑے تھے جس طرح شیر بکری پر، پھر کیا تھا انہوں نے سب کے سامنے میگھ ناتھ پہ لاتوں اور تھپڑوں کی بوچھار کر دی۔ غصے کی حالت میں دانت کچکچاتے ہوئے وہ اپنے بیٹے میگھ ناتھ کو زمین پر پٹک رہے تھے، پھر دونوں کانوں سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے اسے کہنے لگے تھے:

''تجھ حرام غدود کی یہ ہمت کہ اس عمر میں ہی ''پیار'' کا شبد لکھنے لگا''۔ میگھ ناتھ رو رہے تھے ان کی ماں انہیں چھڑانے آئی تو پنڈت شنبھو ناتھ نے اسے زور سے دھکا دیا، وہ دور منہ کے بل گر پڑی اور ''ہائے مری'' کہتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ میگھ ناتھ کی دو بڑی بہنیں اپنے بھائی کو چھڑانے آگے بڑھیں اور دہائی دیتی ہوئی کہنے لگیں:

''پتا جی! ایک بار اسے ہمارے کہنے پر معاف کیجئے اب یہ کبھی بھی پیار کا شبد نہیں لکھے گا''۔

مگر پنڈت شنبھو ناتھ نے اپنی بیٹیوں کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اب انہوں نے ہاتھ میں نائلن کی رسّی لے لی تھی۔ وہ رسی میگھ ناتھ کی ٹانگوں اور کمر پر زور زور سے اس طرح مار رہے تھے جس طرح تانگے والا اپنے گھوڑے کی رفتار تیز کرنے کے لئے اسے چابک سے مارتا ہے۔ میگھ ناتھ نے چیختے اور بلبلاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور کہنے لگے:

''پتا جی اب کبھی بھی زندگی میں پیار کا شبد نہیں لکھوں گا ایک بار معاف کر دیجئے!''

لیکن پنڈت شنبھو ناتھ اسے مسلسل نائلن کی رسی سے مار رہے تھے۔ اسی دوران میگھ ناتھ کی دادی کے کانوں میں ان کے چیخنے چلانے کی آواز پڑی تو وہ فوراً کہیں سے گرتی سنبھلتی پنڈت شنبھو ناتھ کے بالکل سامنے آ کے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی:

''مجھے مار میری جان لے لے، پاگل ہو گیا ہے اس کو مار دے گا کیا؟''

پنڈت شنبھو ناتھ کے ہاتھ ماں کے اچانک سامنے آتے ہی رُک گئے۔ ماں کو سامنے کھڑی دیکھ وہ ندامت سی محسوس کرنے لگے اور پھر ہانپتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گئے تھے۔ اب انہوں نے میگھ ناتھ کو ''گرُوکل'' میں پڑھانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ انگریزی اسکول سے اب انہیں نفرت سی ہو گئی تھی۔

میگھ ناتھ چار سال تک گرُوکل میں پڑھتے رہے۔ وہاں انہوں نے گائتری اور سرسوتی منتروں کے علاوہ بہت سے اچھے اصول و آداب سیکھے۔ اپنے من کی واسنا پر کیسے کنٹرول پایا جائے، عورت کے چلتروں سے کیسے بچا جائے، اپنے تن اور آتما کو کیسے پاک و صاف رکھا جائے اور پھر مخصوص اوقات میں ایشور کے گیان دھیان میں محو ہو جانا یہ سبھی

باتیں میگھ ناتھ نے گُروکل میں سیکھ لی تھیں۔ پھر بعد میں انہوں نے پربھاکرت کی سند حاصل کی تھی اور محکمہ عوامی فلاح و بہبود میں ملازم ہو گئے تھے۔

میگھ ناتھ کے شعور اور تحت الشعور میں اپنے باپ کی شدید مار اس طرح بیٹھ گئی تھی کہ وہ عورت ذات کی طرف ہوسناک نظروں سے دیکھنا تو دور کی بات اک ادھ نظر سے دیکھنا بھی مہاپاپ سمجھتے تھے۔ جب اُن کی شادی ہوئی تو وہ بیوی سے بھی نظریں ملانے اور اس کے پاس جانے میں عار محسوس کرنے لگے۔ تب انہیں دوستوں نے سمجھایا کہ اپنی دھرم پتنی سے بھوگ ولاس کرنا پاپ نہیں ہوتا ہے اور اگر وہ اس کے تن من کو نہیں چھوئے گا تو وہ واپس اپنے میکے چلی جائے گی۔ دوستوں کے سمجھانے کے باوجود میگھ ناتھ نے ڈرتے ڈرتے اپنی دھرم پتنی کے تن من کو چھولیا تھا اور کئی بار چھو لینے کے بعد اب وہ چار بچّوں کے باپ بن چکے تھے۔ انگریزی کلچر سے انہیں سخت نفرت تھی۔ وہ تو اپنے دفتر میں دوسرے ملازموں کی نظروں میں ایک عجوبہ بنے ہوئے تھے۔ کیسری رنگ کا کُرتہ، سفید دھوتی، ماتھے پہ چندن کا تلک، سر پہ بودی اور کندھے سے لٹکتا ہوا جھولا میگھ ناتھ کی ایک مخصوص شناخت تھی۔ سیدھے سادے نرم مزاج، کام، کرودھ، موہ، لوبھ اور اہنکار سے کوسوں دور، اپنی ڈیوٹی کے پابند، زبان پر ہر وقت اوم، ہری اوم کا وِرد رہتا، پرائی عورت پر نظر ڈالنا مہاپاپ سمجھتے تھے۔ صبح جب وہ اپنے دفتر کی طرف نکلتے تو راستے میں ایک کمہارن اپنی دکان پر سجی سنوری بیٹھی دکھائی دیتی، جس کے بال بکھرے ہوئے، کندھوں تک موٹی ننگی بانہیں اور قمیض کا گلا اتنا نشیبی کہ اس کی معمولی جنبش سے قدرت کا انمول خزانہ ہمک ہمک کے باہر آنے کو ترستا۔ اس کے سرخ گالوں اور موٹی موٹی آنکھوں میں نشے کی سی کیفیت پر جونہی میگھ ناتھ کی اچانک نظر پڑتی تو فوراً نظر پھیر لیتے اور گناہ کا احساس ان کے رگ و ریشے میں دوڑ جاتا۔ ان کے دفتر میں جو اسٹاف تھا وہ انگریزی کلچر اور تہذیب کا دلدادہ تھا۔ بات بات پہ ماں بہن کی گالی دینا ان کا تکیۂ کلام تھا۔ کچھ خواتین بھی ان کے دفتر میں کام کرتی تھیں۔ میگھ ناتھ نئے نئے اس دفتر میں آئے تھے اس لئے کچھ اسٹاف ممبرز کے لئے وہ کباب میں ہڈی بنے ہوئے تھے۔ ان کے دفتر میں ہر روز ''رنگ سنسار'' نام کا ایک اخبار آتا تھا جس میں خبریں کم اور عریاں عورتوں کی تصویریں زیادہ ہوتی تھیں۔ میگھ ناتھ کے دفتر میں کام

کرنے والے ملازم ان عورتوں کی عریاں تصویروں کو مزے مزے سے دیکھتے، ایک دوسرے کو دکھاتے اور اس طرح اپنی آنکھوں کو لذت پہنچاتے یہ تصویریں اس قدر عریاں ہوتی تھیں کہ مخصوص مقامات بھی برائے نام ہی چھپے ہوتے۔ میگھ ناتھ کی نظر جونہی ان تصویروں پر پڑتی تو وہ شرم وحیا کی وجہ سے اخبار کو دور پھینک دیتے۔ ان کے دفتر کا کلرک جونہی لیپ ٹاپ کھولتا تو اس پہ بھی سب سے پہلے کسی حسین انگریزن کی تقریباً اسی فیصدی عریاں تصویر اُبھرتی۔ اسی طرح ان کیساتھ دفتر میں کام کرنے والوں کے پاس ایسے موبائل سیٹ تھے جنہیں آن کرتے ہی نیم عریاں عورت کی تصویر آنکھوں میں جنسی برانگیختگی کا نشہ پیدا کر دیتی۔ میگھ ناتھ یہ سب کچھ دیکھتے ہی فوراً غم وغصے میں مبتلا ہو جاتے اور اندر ہی اندر کڑھتے۔ اپنے دفتر کے ان تمام ملازموں پہ لعنت بھیجتے جو عورت کو عریاں دیکھنے کے شوقین تھے اور یہ سوچ کے رہ جاتے کہ کیا ان کی اپنی ماں بہن نہیں ہے! دفتر سے چھٹی ہونے کے بعد وہ سیدھے اپنے گھر پہ آجاتے، آگے ان کے بچے ٹیلی ویژن پر ''فیشن شو'' اور ''چترہار'' جیسے نیم عریاں پروگرام بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے ہوتے۔ وہ بچوں کو ڈانٹتے اور انہیں آستھا، سنسکار اور ست سنگ جیسے دھارمک چینل دیکھنے پر مجبور کرتے لیکن بچے اُن کے پیٹھ پھیرتے ہی پھر اپنی پسند کے وہی پروگرام دیکھنے لگتے۔ میگھ ناتھ اندر ہی اندر کڑھتے، جھنجھلاتے اور دکھی ہو کر گھر کے کسی گوشے میں رام نام جپنے لگتے۔

گرمیوں کے دن تھے میگھ ناتھ اپنے دفتر سے تقریباً تین بجے اپنے گھر پہنچ گئے۔ نہانے اور دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ کچھ وقت لیٹنے کے بعد جب اُٹھے تو ان کے جی نے چاہا کہ آج وہ گاندھی میموریل پارک اور قومی وراثت ہاؤس گھومنے جائیں گے، چنانچہ وہ گھر سے نکل پڑے۔ وہ کئی برسوں کے بعد آج گاندھی میموریل پارک دیکھنے جارہے تھے۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ حکومت نے گاندھی میموریل پارک کو اب جدید طرز میں کافی سجا رکھا ہے اور قومی وراثت ہاؤس میں نئے آرٹسٹوں نے اپنے فن کے اعلیٰ نمونے نصب کئے ہوئے ہیں۔ اسی شوق کی تکمیل میں میگھ ناتھ ان دونوں جگہوں کو دیکھنے جارہے تھے۔ وہ جب گاندھی میموریل پارک کے مین گیٹ پر پہنچے تو پچیس روپے کا ٹکٹ خریدنے کے بعد پارک میں داخل ہوئے۔ پارک کا اندرونی منظر ان کے

مزاج اور ضمیر کے بالکل منافی تھا۔ وہ جوں جوں آگے قدم بڑھا رہے تھے انہیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف ملبوسات میں نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ایک دوسرے سے بوس و کنار کرتے، بغل گیر ہوتے اور حیا سوز حرکتیں کرتے نظر آئے۔ میگھ ناتھ بار باران پر سے نظریں ہٹاتے رہے اور دل ہی دل میں یہ فحش ماحول دیکھ کر گھٹن سی محسوس کرنے لگے۔ انہیں اپنا آدرش وادی ذہن خطرے میں دکھائی دینے لگا بالآخر وہ مجبوراً آدھی پارک دیکھنے کے فوراً بعد باہر آ گئے۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور دیر تک کھڑے یہ سوچتے رہ گئے کہ کیا یہی گاندھی میموریل پارک ہے! اب انہوں نے قومی وراثت ہاؤس کا رُخ کیا وہاں پہنچے تو گیٹ پر پچاس روپے کا ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد جونہی اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مجسمہ سازوں نے عورت کے تمام پوشیدہ حصوں کو بالکل عریاں کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہوا ہے۔ مختلف مقامات پر عورت کو عریاں مجسمے کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ میگھ ناتھ نے فوراً ان پر سے بھی نظریں ہٹائیں اور انتہائی دکھی ہوئے۔ انہیں اس وقت اپنے پتاجی کی وہ مار یاد آئی جو انہوں نے ''پیار'' کا شبد لکھنے پر کھائی تھی۔ آخر کار یہاں بھی مایوس ہو کر گیٹ سے باہر آ گئے اور یہ سوچتے ہوئے حیران رہ گئے کہ کیا یہی قومی وراثت ہاؤس ہے! اب وہ سیدھے واپس اپنے گھر آنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دور پیدل چلنے کے بعد اچانک مین روڈ کے کنارے سنیما ہال کے سامنے لوگوں کا ہجوم سا دیکھا جس میں زیادہ تر نوجوان اور ادھیڑ عمر کے مرد ایک لمبی قطار میں کھڑے نئی فلم دیکھنے کے شوق میں ٹکٹ لے رہے تھے۔ میگھ ناتھ بھی ان لوگوں کو دیکھتے ہی سنیما ہال میں چلے گئے، سامنے ایک طرف دیوار پر نئی فلم کا پوسٹر لگا ہوا تھا۔ اسی پوسٹر پر ایک جگہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا Only for Adults یعنی صرف شادی شدہ افراد ہی اس فلم کو دیکھیں۔ اب میگھ ناتھ کے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ آخر یہ فلم شادی شدہ لوگوں کے لئے ہی مخصوص کیوں رکھی گئی ہے؟ ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ہوسکتا ہے کہ اس فلم میں ضرور کرم دھرم کو فلمایا گیا ہو۔ ان کے من میں اس فلم کو دیکھنے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ وہ بہت جلد اب سنیمال ہال میں گھسنا چاہتے تھے چنانچہ وہ بھی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ فلم شروع ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا، وہ رینگتے ہوئے کونٹر تک پہنچے اور ڈیڑھ سو روپے کا ٹکٹ خرید کر بالکونی مین جا بیٹھے۔ پورے دس

منٹ کے بعد یہ نئی فلم شروع ہوگئی۔

پہلے منظر میں ایک شادی شدہ عورت کو ایک غیر شادی شدہ نوجوان سے محبت کرتے دکھایا گیا تھا۔ دوسرے منظر میں ایک تالاب میں ان دونوں کو بالکل عریاں حالت میں دکھایا گیا اور پھر تیسرا منظر نا قابل بیان! میگھ ناتھ سنیما ہال کی تاریکی میں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اب انہوں نے آنکھیں بند نہیں رکھی تھیں بلکہ کھلی آنکھوں برابر سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ ڈیڑھ سو روپے کا ٹکٹ خرید کر بالکونی میں جا بیٹھے تھے۔ تیسرے منظر نے ان کے پورے وجود میں بہت زیادہ حرارت پیدا کر دی تھی جو بعد میں آتش فشاں کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ پورے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب میگھ ناتھ سنیما ہال سے باہر آئے تو وہ انتہائی مایوس تھے۔ ان کی آنکھوں نے آج جو کچھ دیکھا تھا وہ انہوں نے زندگی میں آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُن کا آج جیسے سب کچھ لٹ چکا تھا، ان کے شریر میں جو اُتھل پتھل ہوئی تھی وہ انہیں بار بار مایوس کر رہی تھی۔ وہ کیا سوچ کے سنیما ہال میں آئے تھے اور کتنی قیمتی چیز لٹا کے یہاں سے جا رہے تھے! وہ یوں محسوس کر رہے تھے کہ جیسے آج ان کی آنکھوں نے زنا کیا ہو۔

■❖■

واسنا پہ ماتم کناں تھا۔ کیسری رنگ کا کُرتہ اور اُسی رنگ کی دھوتی میں ملبوس بابا بے سُدھ پڑے تھے اُن کی ٹانگیں اور بازوؤں کی بے ترتیبی سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اُن کے جسم سے اُن کی روح کا کبوتر عالم بالا کی طرف پرواز کر چکا ہو۔ اُن کے جھریوں بھرے ماتھے پر سُرخ رنگ کے ہلکی کی باریک سی دھاریاں ایسی دِکھ رہی تھی کہ جیسے کسی شرارتی لڑکے نے اُن کے ماتھے پہ اُوپر سے نیچے کی طرف تیز بلیڈ سے کٹ مارا ہو اور اس طرح بابا کے کمزور ماتھے پہ یہ لہو لکیر اُبھر آئی ہو۔ اُن کی جٹائیں اور اَدھ سفید داڑھی اُن کی لغزش کی چغلی کھا رہی تھی۔ فردوس احمد بابا کو اس پُر ہول حالت میں دیکھ کر خوفزدہ سے ایکدم کھڑے کے کھڑے رہ گئے، ان کے دماغ میں بار بار سوال اُبھرتا رہا کہ کیا بابا کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟ بابا کو کیا ہو گیا ہے، آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ انہوں نے چاروں طرف نظریں گھمائیں تو دُور دُور تک کوئی بھی آدم زاد نظر نہیں آیا، وہ ریلوے اسٹیشن کی جانب دوڑے۔ ریلوے اسٹیشن سے دائیں جانب ایک چوراہے پہ چند آدمی کھڑے باتیں کر رہے تھے، فردوس احمد کی نظر اُن پہ پڑی تو وہ ہانپتے کانپتے اُن کے پاس پہنچے اور حواس باختہ ہو کر اُن سے کہنے لگے ''آپ مہربانی کر کے میرے ساتھ چلئے، اُدھر پیچھے درختوں کے سائے میں ایک بابا کو کچھ ہو گیا ہے، بے حس وحرکت پڑے یوں لگ رہے ہیں کہ جیسے بابا کو کسی نے مار دیا ہو، آپ فوراً چلئے''۔

چار آدمی فردوس احمد کے ساتھ دوڑتے بھاگتے بے سدھ بابا کے پاس پہنچے، انہیں دوڑتے دیکھ کچھ اور بھی آدمی وہاں پہنچ گئے۔ اب بابا کے آس پاس لوگوں کا ایک ہجوم سا اکٹھا ہو گیا۔ ایک آدمی نے بابا کی نبض ٹٹولی تو معلوم ہوا کہ اُن کی نبض برابر کام کر رہی ہے۔ دوسرے نے ماتھے پہ ہاتھ رکھا تو ماتھے کی کیفیت بھی مناسب معلوم ہوئی۔ دو آدمی بابا کے پیروں کو تلسنے لگے یہ سوچتے ہوئے کہ ضعف کے باعث کہیں ان پہ بے ہوشی نہ طاری ہوئی ہو۔ کسی کی بھی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر بابا کو کیا ہو گیا ہے، ابھی لوگ اسی مخمصے میں اُلجھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ناگپال جیسا چھٹا ہوا بدمعاش اور شرابی کہیں سے آ نکلا۔ اُس نے بابا کو دیکھتے ہی ان کی کیفیت بھانپ لی۔ وہ پہلے زور سے ہنسا اور پھر کہنے لگا ''ارے چھوڑو اس بابا کو اس نے فروٹی پی ہے! یہ وہی بابا تو ہے جو ابھی پچھلے ہفتے اسی شہر میں ایک

جگہ سینکڑوں مردوں اور عورتوں کو رام کتھا سنا رہا تھا!''

ناگپال کی باتیں سن کر سب لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔ اب وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ بابا کو ہوش میں لانے کے لئے اسپتال لے چلیں یا پولیس تھانے کی طرف۔

■❖■

باہر اور اندر کا منظر

سیوا ناتھ کی مٹھائیوں کی دُکان "دین دھرم سویٹ شاپ" کے نام سے ملک بھر میں محض اس لئے مشہور و معروف ہوگئی تھی کہ وہاں خالص دیسی گھی سے مٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ دُکان ایک کوہستانی علاقے سے گزرنے والی شاہراہ کے کنارے واقع ہے۔ اس دُکان کے آس پاس مٹھائیوں کی اور بھی دُکانیں ہیں اُن کے علاوہ چائے، پان، کولڈ ڈرنک اور سبزی و پھل فروشوں کی بھی دُکانیں ہیں مگر سیوا ناتھ کی "دین دھرم سویٹ شاپ" کو جو مرکزیت، اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے وہ کسی دوسری دُکان کو حاصل نہیں ہے۔ دراصل یہ دُکان ایک ایسے مقام پر واقع ہے جو قدرتی ماحول و مناظر سے آراستہ و پیراستہ ہے اور اسے سیاحوں کے لئے دلکش بنانے میں حکومت نے خاصی محنت سے کام کیا ہے۔ سیوا ناتھ کی دُکان کے سامنے سے گزرنے والی تقریباً تمام سیاحوں کی گاڑیاں چند لمحوں کے لئے یہاں ضرور رُکتی ہیں۔ مرد، عورتیں، بچے بوڑھے اور جوان بڑے شوق سے گاڑیوں سے باہر نکلتے ہیں اُن کے چہرے فطری ماحول کو دیکھتے ہی بارونق ہو جاتے ہیں وہ اپنے اپنے کیمروں اور قیمتی موبائل فونوں سے اپنی اور اس دلکش ماحول کی تصویریں کھینچتے ہیں تا کہ اپنی یادوں کے البم میں اُنہیں محفوظ رکھ سکیں۔ سیوا ناتھ کی دُکان پہ مٹھائیاں خریدنے والوں کی کافی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ سویرے سات بجے سے رات کے بارہ بجے تک سیوا ناتھ کی دُکان کھلی رہتی ہے۔ دُکان کو نہایت دیدہ زیب بنایا گیا ہے تا کہ یہاں سے گزرنے والا ہر مسافر اس دُکان میں داخل ہونے اور یہاں سے اپنی پسند کی مٹھائی خریدنے کے لئے بیتاب ہو جائے۔ دُکان کے آگے بڑے اور خوب صورت ڈیزائن میں بورڈ آویزاں کیا گیا ہے

جس پہ ہندی، اُردو اور انگریزی میں موٹے موٹے لفظوں میں ''دین دھرم سویٹ شاپ'' لکھا گیا ہے اور آخر پہ یہ خوش کُن سطر لکھی گئی ہے کہ ''یہاں پہ خالص دیسی گھی سے میٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں''۔ دکان کے دائیں بائیں اور سامنے دیواروں پہ پتیسہ، کراچی حلوہ، جلیبی، سون پاپڑی، بیسن برفی، گلاب جامن، شانہ مرغی، امرتی، میسو اور گجریلا مٹھائیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ سیوا ناتھ دور اندیش اور تجارتی ذہنیت کے حامل ہیں اپنی اس دکان سے آج تک وہ کروڑوں روپے کما چکے ہیں۔ تقریباً بیس برس سے یہ دکان چلا رہے ہیں۔ ایک درجن نوکر چاکر، ہر وقت مٹھائیاں تیار کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں الگ الگ کام سونپے گئے ہیں کچھ اندر چاشنی تیار کرتے ہیں کچھ مٹھائی تیار ہونے پر اُسے ترتیب سے ایک طرف رکھتے ہیں اور کچھ بڑے خوشنما ڈبوں میں میٹھائیاں ڈالتے اور اُنہیں سیوا ناتھ کی بیٹھک کے سامنے یہاں وہاں رکھتے ہیں۔ مٹھائی کے ڈبے نہایت دیدہ زیب اور خوش نما معلوم ہوتے ہیں جن پر ''دین دھرم سویٹ شاپ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مٹھائی خریدنے والے اکثر قطار میں کھڑے رہتے ہیں۔ ایک سو روپے سے لے کر پانچ سو روپے تک مٹھائی کا ڈبہ بکتا ہے۔

جون کا مہینہ تھا، گرمی اپنے پورے جوبن پر تھی گرم علاقوں کے صاحبِ ثروت لوگ سیر و تفریح کے لئے سرد علاقوں کی طرف جا رہے تھے۔ احسان الحق اور رادھے شیام دونوں گہرے دوست بھی اپنے اہل و عیال کے ہمراہ ٹھنڈے علاقوں کی طرف سیر و تفریح کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ سیوا ناتھ کی دُکان پہ آج میٹھائیاں خریدنے والوں کی کافی بھیڑ تھی۔ احسان الحق اور رادھے شیام بھی میٹھائی خریدنے کے لئے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ کچھوا چال چل رہی لوگوں کی قطار دھیرے دھیرے سمٹنے لگی۔ سیوا ناتھ اپنے گاہکوں کی لمبی قطار دیکھ کے بہت خوش ہو رہے تھے وہ تو بس گاہکوں سے روپے پکڑ لینے کا کام کر رہے تھے اور نوکر گاہک کو میٹھائی کا ڈبہ پکڑاتے، قطار میں کھڑے کھڑے احسان الحق کی نظر اچانک دُکان کے اندر دُور پیچھے اُس بڑے ہال میں گھوم گئی جہاں مٹھائیاں تیار کی جاتی تھیں۔ اندر ہال میں بناسپتی کے کنستر ترتیب سے رکھے ہوئے تھے اور مٹھائیاں بنانے والے سیوا ناتھ کے کاریگر کالے بھتنے سے نظر آ رہے تھے، لوہے اور المونیم کی بڑی بڑی

پراتوں میں گرم گرم مٹھائی کا رقیق مواد ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھا گیا تھا۔ احسان الحق نے اپنے گہرے دوست رادھے شیام کو بھی اندر کا منظر دیکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ اب یہ دونوں دوست بظاہر قطار میں کھڑے تھے لیکن اُن کی نگاہیں میٹھائیاں تیار ہونے والے اُس بڑے ہال کے اندر کی ہر شے پر گردش کر رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بڑا چوہا کہیں سے آنکلا اور پرات میں پڑی مٹھائی کے اوپر اُچھل کود مچاتے ہوئے ایک جگہ سے کھانے لگا، اُسے دیکھ اور چوہے بھی کہیں سے آ گئے اور تمام پراتوں پہ دھما چوکڑی مچانے لگے۔ ایک نوکر نے چوہوں کو بھگایا تو کہیں سے کالے رنگ کی بلی آ گئی اور اُس نے پرات میں منہ مارا بلی کو بھگاتے ہوئے دوسرے نوکر کو زور کی چھینک آئی تو اُس کی ساری رینٹ پرات میں گر پڑی۔ احسان الحق نے اپنے دوست رادھے شیام سے کہا:

''یار! مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر متلی آ رہی ہے''

رادھے شیام نے جواب دیا

''یار میرا بھی یہی حال ہے!''

احسان الحق نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا

''میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُس دکان سے پتیسے کا ڈبہ خریدوں لیکن اب میں کچھ بھی نہیں خریدوں گا''۔

رادھے شیام نے کہا

''میرے دل نے چاہا تھا کہ شانہ مرغی کا ڈبہ خریدوں مگر یہ سب کچھ دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں بھی یہاں سے کچھ نہیں خریدوں گا''۔

احسان الحق اور رادھے شیام دونوں دوست اپنی گاڑیوں کی طرف واپس جانے لگے تو سیوا ناتھ نے اُنہیں پکارا۔

''آیئے آیئے آپ کہاں جا رہے ہیں؟ واپس آیئے نا آپ خالی ہاتھ کیوں جا رہے ہیں''

دونوں دوستوں نے سیوا ناتھ کو کوئی بھی جواب نہیں دیا۔ سیوا ناتھ کی نظر جب دُکان کے اندر والے کھلے دروازے پر پڑی تو غصے سے اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور تب

انہوں نے اپنے نوکروں کو بڑی کرخت آواز میں ڈانٹتے ہوئے کہا ''تم میں سے کس نالائق نے اندر کا دروازہ کھلا رکھا تھا کہ بیس برس میں آج پہلی بار میری اس دُکان سے دو گاہک خالی ہاتھ واپس گئے ہیں۔ اکثر کہتا رہتا ہوں کہ اندر کا دروازہ ہمیشہ بند رکھا کرو، ٹھہرو آج تم سب کی رات کو میٹنگ لیتا ہوں''۔

■❖■

اندر کی باتیں

(۲۰۱۱ء کے نام)

نریش رانا کا سات ستارہ ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ مہانگر کے بالکل وسط میں ہر خاص و عام کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔ کھانے پینے اور رہائش کی تمام سہولیات اس میں موجود ہیں۔ سرمایہ دار طبقے کے لوگ اس میں بڑے شوق سے ٹھہرتے ہیں جبکہ مفلوک الحال طبقے کے لوگ اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک دنیا اس میں آباد رہتی ہے۔ طرح طرح کے ارمان بھرے دلوں کے لوگوں کا اس میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ سات منزلہ یہ عالیشان ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ ہر وقت نئی نویلی دُلہن کی طرح سجا رہتا ہے۔ خاص کر رات کے وقت جب بجلی کے قمقموں کی دھنک رنگ روشنی سے پل پل میں پورے ہوٹل کی چاروں سمتوں پر مختلف طرح کے خوشنما ڈیزائن تیار ہوتے چلے جاتے ہیں تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اس ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ کی ہر چیز نہایت نفیس، دیدہ زیب، آرام دہ اور عمدہ ہے کہ جو اس میں ٹھہرنے والوں کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔ اس میں داخل ہونے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے اُس کے دل و دماغ سے دُنیا کے غموں، اُلجھنوں اور مسائل کا غبار دُھل گیا ہو اور جسمانی و روحانی سکون کے تمام دروازے اُس کیلئے کھُل گئے ہوں۔ اس ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں ہے کہ اس میں کام کرنے والے ہر چھوٹے بڑے تمام ملازم نہایت مہذب، شائستہ اور حلیم ہیں۔ مسافروں کو اپنے کمروں میں بیٹھے بیٹھے ہر چیز برقی بٹن دباتے ہی مل جاتی ہے۔

بیرے اپنی خوش اخلاقی، سلیقہ شعاری اور نظم وضبط سے مسافروں کا دل جیت لیتے ہیں۔ جہاں تک کھانے پینے کی چیزوں کا تعلق ہے وہ نہایت لذیذ اور ملاوٹ کے بغیر دستیاب ہوتی ہیں۔ نریش رانا بذات خود ایک جہاں دیدہ، دوراندیش اور وضعدار شخصیت کے مالک ہیں۔ کروڑ پتی ہیں۔ وہ روپیوں کے پیچھے نہیں بھاگتے بلکہ روپے اُن کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اپنے اس عالیشان ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ کے باعث انہیں روپے گننے سے فرصت نہیں ملتی۔ سوسو کے نوٹوں سے لے کر ہزار روپے تک کے نوٹوں کی گڈیاں گننے کیلئے اُن کی بیٹھک کے سامنے مشین رہتی ہے۔ اس طرح صبح سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک لاکھوں روپے اُن کے اکاونٹ میں جمع ہوجاتے ہیں۔ نریش رانا کے سات ستارہ ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ کا صدر دروازہ ہر خاص و عام کیلئے کھلا رہتا ہے۔ مگر اس میں وہی لوگ داخل ہوتے ہیں جن کی جیب اکثر گرم رہتی ہے۔ تین طرح کے لوگ اس ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ میں زیادہ تر ٹھہرتے ہیں۔ ایک وہ مرد عورتیں جو سیر وسیاحت کی غرض سے چند ہفتوں کے لئے اپنے گھروں نکلے ہوتے ہیں وہ ہفتہ دس دن کے لئے اُس ہوٹل میں قیام پذیر رہتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جنہیں سرکاری مہمان کے طور پر نریش رانا کے ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ میں دو یا تین دن کیلئے ٹھہرنے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ تیسرے وہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جو کبھی کبھار اپنا دل بہلانے اور ذہنی تناؤ دور کرنے کیلئے چند گھنٹوں کی خاطر اس ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ میں آتے ہیں۔ نریش رانا اپنے جنرل مینجر سے ہر آنے والے کا نام، پتہ اور ضروری معلومات کا باضابطہ ایک رجسٹر میں اندراج کرواتے ہیں اور اس کے بعد آنے والے کو کمرے کی چابی سونپ دی جاتی ہے۔ نریش رانا اور اُس کا جنرل مینجر مردوں اور عورتوں کے چہرے نہیں پڑھتے اور نہ ہی اس چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ کس عورت کا کس مرد کے ساتھ یا کس لڑکے کا کس لڑکی کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ چہرے پڑھنا یا جائز وناجائز رشتوں کی تہہ تک جانا یہ کام تو پولیس اور سی آئی ڈی والوں کا ہے۔ نریش رانا یا اُس کے ملازموں کو اس سے کیا لینا دینا۔

نریش رانا اپنی مووونگ چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک اُن کی نظر کمل کانت پر پڑی جو آہستہ آہستہ ہوٹل کے صدر دروازے سے اندر آرہا تھا۔ نہایت سُست، بے رونق

چہرہ، سر پہ بڑے بڑے بال بکھرے ہوئے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے یہ زندگی سے روٹھ گیا ہو یا زندگی اس سے روٹھ گئی ہو۔ جونہی وہ نریش رانا کے قریب پہنچا تو وہ اپنی موونگ چیئر پر سے ایکدم کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔

''ارے کمل کانت! میرے بھائی کیا حال ہے تیرا؟ مجھے تو تو پہلی نظر میں آج پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا'' دونوں بڑے تپاک سے آپس میں بغلگیر ہوئے، پھر کمل کانت ایک طرف کُرسی پہ بیٹھ گیا تو نریش رانا نے اُسے پوچھا۔

''کمل کانت! تُو نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے بھائی! کہاں گیا تیرا وہ ہشاش بشاش چہرہ! آج سے چھ مہینے پہلے جب ہماری ملاقات ہوئی تھی تو تیرا نورانی چہرہ اور سڈول جسم دیکھ کے مجھے تجھ پر رشک آ گیا تھا لیکن آج تیرا حال دیکھ کے میں مایوس ہو رہا ہوں۔ آخر کیا بات ہے؟ میں تیرے وجود میں آئی ہوئی اس سونامی کو جاننا چاہتا ہوں جس نے تیری یہ حالت بنائی ہوئی ہے۔''

کمل کانت ابھی تک بالکل خاموش تھا۔ اُس کی مایوس کُن صورت اور مکمل خاموشی سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی مجذوب ہو۔ پھر اُس نے بڑے جذباتی انداز میں اپنی واردات غم بیان کرنا شروع کر دی اُس نے کہا۔

''نریش رانا صاحب! میں آپ کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں اور سمجھتا رہوں گا مجھ پہ جو بیتی ہے وہ کسی پہ نہ بیتے! اگر آپ میرے رنج و غم سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو میں آپ ہی سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ بالفرض محال اگر آپ کا بیٹا جس کی عمر کل دس سال کی رہی ہو اُسے دو غنڈے آپ کے گھر سے اُٹھا کر لے جائیں اور آپ روتے ہوئے ان غنڈوں کے پیچھے جائیں اور زار و قطار روتے ہوئے انہیں منت سماجت کرنے لگ جائیں کہ میرا بیٹا مجھے واپس دے دو! لیکن آپ کی حالت زار دیکھنے کے باوجود دونوں غنڈے بندوق کی نوک پہ آپ کے دونوں ہاتھ آپ کی پشت پہ مضبوط رسّی سے باندھ دیں اور پھر آپ کے بیٹے کے کپڑے اُتار لیں، اُس کے بعد آپ کے سامنے اُس کا ایک ایک انگ کاٹنا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ آپ کا بیٹا آپ کی نظروں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر جائے تو رانا صاحب آپ پر کیا گزرے گی! یا ایک اور سانحہ آپ کی ذات سے منسوب کرتا ہوں، مثال کے طور پر آپ جون

یا جولائی کے مہینے میں ایک تپتے ہوئے ریگستان سے تن تنہا گزر رہے ہوں اور پیاس کی شدت سے آپ کی زبان مُنہ سے باہر لٹک رہی ہو کہ اچانک ایک شخص ہنستا مسکراتا آپ کو نظر آجائے اور وہ آپ کو یہ یقین دلائے کہ میں آپ کی رہبری کروں گا بس تھوڑی دُور آگے میرے ساتھ چلیں وہاں پانی سے لبریز ایک کنواں ہے۔ ہم دونوں وہاں پانی پیئیں گے۔ ظاہر ہے آپ کی آدھی پیاس اس شخص کی باتیں سنتے ہی بجھ جائے گی، لیکن جب آپ اُس کنوئیں پر پہنچتے ہیں تو کنواں بالکل خشک ہے اور کنوئیں میں نیچے جھانکتے ہی وہ شخص آپ کو دھکّا دے کر کنوئیں میں گرا دیتا ہے۔ رانا صاحب! مجھے بتایئے اُس وقت آپ کے دل پہ کیا بیتے گی! بس میرے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا سا سلوک کیا گیا ہے میرے بھائی''!

نریش رانا نے کمل کانت کی باتیں سُن کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بڑے فکر مند لہجے میں کمل کانت سے پوچھنے لگے۔

''کمل کانت! آخر تیرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ کھُل کے بات کرنا تاکہ مجھے بھی پتا چلے کہ معاملہ کیا ہے''؟ کمل کانت نے کہا۔

''سنیئے بھیا! آپ ہی کے کہنے پر میں نے دارالعلوم کے شعبۂ تاریخ میں اسسٹنٹ پروفیسری کی آسامی کیلئے فارم بھرا تھا لیکن مجھے بُری طرح نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ میرا مستقبل تاریک بنا دیا گیا ہے۔ یہ میرے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ میرا حق بُری طرح مجھ سے چھینا گیا ہے۔ چھ ماہ سے میرے دل میں رنج و غم اور بے چینی کی اِک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ میرے مستقبل کو تاریک بنانے والا شخص کون ہے؟ میرا حق مجھ سے کس نے چھینا ہے''؟

نریش رانا نے کمل کانت کی باتیں سُنیں تو چونک اُٹھے اور کہنے لگے ''ارے ہاں یہ بات ہے، جانتا ہوں۔ ہاں ہاں سب معلوم ہے میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ تو کسی گھریلو مسلے میں اُلجھ کے رہ گیا ہوگا تبھی تو اِس قدر کمزور اور پریشان حال ہے۔ کمل کانت! تیرے خلاف بنائی گئی پلاننگ کا مجھے پورا پتا ہے غور سے سُن، تیرا حق چھیننے والا شخص شعبۂ تاریخ کا سرپرست چترنجن باسو ہے۔ میری اُس سے دوستی تو نہیں البتہ اُس نے مجھے اپنا دوست بنا رکھا ہے۔ اُس کا اکثر میرے پاس آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اپنے دل کی ہر ایک بات مجھے سُنا دیتا

ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بہت سے باتیں وہ اپنی دھرم پتنی سے بھی چھپاتا ہے۔ اُسے مجھ پہ پورا اعتماد ہے کہ میں اُس کی ہر ایک بات کو پوشیدہ رکھنے والا ہوں۔ لیکن کمل کانت! تُو مجھے نہایت عزیز ہے کیونکہ میں تجھ میں انسانیت کے جوہر اور ذہانت کے موتی دیکھتا ہوں جبکہ چتر نجن باسو میری نظر میں بدترین منافق ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب وہ ممتحن بن کے کہیں جاتا ہے تو کال گرل بک کرواتا ہے اور ایسی مدرا کی خواہش میں رہتا ہے جس کے پینے سے آدمی کی آنکھیں دن کو ہی تارے گننے لگتی ہیں اور وجود زمیں پر ڈھیر ہونے لگتا ہے۔ کمل کانت سُنو! چتر نجن باسو بہت چُتر آدمی ہے وہ اہم سیاسی، ادبی اور سماجی شخصیات کو قابو کرنے کیلئے محفلیں منعقد کرتا ہے۔ پچاس روپے کا گلدستہ اُن کے ہاتھوں میں تھما دیتا ہے، ڈیڑھ سو روپے کا شال اُن کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے اور اس منافقانہ انداز سے وہ اُن کے روشن ضمیر کی کلغی دبوچ لیتا ہے پھر وہ اُس کی بداعمالیوں پہ لب کشائی نہیں کر پاتے! لیکن کمل کانت! تجھے میں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔ میں تیری وہ نیکی کبھی بھول نہیں سکتا جب تو نے آج سے دس سال پہلے میرے بیٹے نریندر کو جس کی عمر اُس وقت کل پانچ سال کی تھی ایک بریک فیل گاڑی سے بچایا تھا۔ دوست بے وفا ہوسکتا ہے لیکن بھائی کا رشتہ نہایت مضبوط نہ سہی ناپائیدار بھی نہیں ہوتا، تو میرا بھائی ہے کمل کانت! میں یقین سے کہتا ہوں جتنا میں چتر نجن باسو کو اندر اور باہر سے جانتا ہوں کوئی دوسرا نہیں جانتا"۔ کمل کانت سے رہا نہ گیا اُس نے پوچھا۔

"رانا صاحب اگر چتر نجن باسو کے ساتھ آپ کی اتنی جان پہچان تھی یا اگر وہ آپ کو اپنا دوست سمجھتا ہے تو میری اُس سے سفارش کرتے آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

نریش رانا نے کہا

"ارے پُوری بارت تو سُن لے نا ساری حقیقت تیرے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں چتر نجن باسو کو چار چیزیں بہت پیاری ہیں اور ان چیزوں کے حصول کی خاطر وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ چار چیزیں ہیں۔ مدرا، دھن، ناری، اور چانڈو۔ میں اُن لمحات کو تادمِ حیات نہیں بھول پاؤں گا جب اُس نے مجھے فون پہ کہا تھا۔

"رانا صاحب! آداب! چتر نجن باسو بول رہا ہوں۔ میرے تین مہمان ہوائی

جہاز کے ذریعے ہمارے شہر میں آرہے ہیں۔ تینوں کا قیام اور طعام آپ کے سات ستارہ ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ میں ہوگا۔ اس لئے ساتویں منزل پہ تین کمروں کی بکنگ میرے نام پر رکھ لیجئے۔"

میں نے کہا تھا "کوئی بات نہیں سب ہو جائے گا"

دوسرے دن چترنجن باسو کے تینوں مہمان میرے ہوٹل میں پہنچ گئے تھے۔ میں نے بذات خود اُنہیں پہلی منزل سے لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پہ پہنچا دیا تھا۔ تین کمروں میں ان کی خدمت کیلئے تین خدمت گار لگا دیئے تھے۔ رات کے تقریباً نو بجے چترنجن باسو اور اس کے ساتھ سانولے سانولے رنگ کا بالکل ایک پتلا سا آدمی ہوٹل میں چلے آئے۔ دونوں ڈرے سہمے ہوئے سے معلوم ہو رہے تھے۔ اُن کے چہروں سے بوکھلاہٹ عیاں ہو رہی تھی۔ چاروں طرف نظریں گھما رہے تھے کہ کوئی اُنہیں دیکھ نہ لے۔ چترنجن باسو نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا

"رانا صاحب! میں بڑے ہی نازک وقت میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں اپنے مہمانوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اپنا گہرا دوست سمجھتا ہوں۔ کوئی بھی بات آپ سے نہیں چھپاتا ہوں آپ فوراً مجھے میرے مہمانوں سے ملوایئے"۔ میں نے کہا "ہاں ہاں ضرور کیوں نہیں"۔

ہم تینوں لفٹ میں سوار ہوئے تو میں نے چترنجن باسو سے پوچھا۔

"باسو صاحب! یہ چھوکرا کون ہے؟ اسے آپ کہاں سے لائے ہیں اس کا کوئی اتہ پتہ تو بتایئے"؟

چترنجن باسو کے سیاہ ہونٹوں پہ مُسکان سی اُبھری اور کہنے لگا

"رانا صاحب! یہ اپنا ہی آدمی ہے کوئی پرایا تھوڑی ہے"

چند ہی لمحوں میں ہم تینوں لفٹ سے اُترے۔ تینوں مہمان الگ الگ کمروں میں بیٹھے تھے۔ تینوں کمرے نمبروار تھے میں نے سب سے پہلے کمرہ نمبر ۴۳۵ کی بیل بجائی تو اندر سے فوراً ایک خوب صورت اور لحیم وشحیم شخصیت نے جونہی دروازہ کھولا تو چترنجن باسو لپک کر آگے بڑھا اور مسرت آمیز لہجے میں بغل گیر ہوتے ہوئے اُس شخص سے کہنے لگا۔

''منوج اگروال صاحب! آداب سُنایئے کیسے رہے؟ کسی کٹھنائی کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟ میں آپ کا خادم ہوں۔ دل میں کئی وسوسے اُٹھ رہے تھے کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی ہو، جا کے معلوم کرلوں۔ اس لئے آپ کے پاس اس وقت چلے آیا''۔

منوج اگروال بولے

''باسو صاحب! آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کیسی چنتا! بس سب کُشل منگل ہے''

چترنجن باسو نے اپنے شانے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''اگروال صاحب! کسی بھی چیز کی آپ کو ضرورت پڑے تو نریش رانا صاحب کو فون پہ بتادیجئے گا، یہ پل بھر میں سب کچھ آپ کے سامنے پیش کروادیں گے۔ رانا صاحب اور میں ایک ہی وجود کے دوروپ ہیں''۔

منوج اگروال نے مسکراتے ہوئے کہا

''بہت اچھا رانا صاحب''

چترنجن باسو نے موقع غنیمت جانا اور اپنے اصلی مدعا پہ آیا، کہنے لگا

''اگروال صاحب آپ کو معلوم ہی ہے کل پورے دس بجے دارُالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کے آفس میں شعبۂ تاریخ کی اسسٹنٹ پروفیسری کے لئے انٹرویو شروع ہو رہا ہے۔ آپ اُس میں بحیثیت ماہر تاریخ موجود ہونگے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ یہ نوجوان اسے سر سے پیر تک دیکھ لیجئے اس کا نام خیالو رام ہے۔ اس کا انتخاب ہونا چاہیے۔ یہ ہسٹری میں ایم فل پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ہے۔ نہایت شریف، دیانتدار اور محنتی ہے۔ اس لئے آپ نے اسے کل انٹرویو میں جو کچھ بھی پوچھنا ہے اسے وہ سب کچھ بتادیجئے۔ کوشش کیجئے کہ اس کی تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم، والدین کا نام، شادی شدہ ہو، یا غیر شادی شدہ اور پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا؟ اس سے آگے سوالوں کا سلسلہ نہ بڑھے ورنہ اس شریف آدمی کی زبان لڑکھڑا کر رہ جائے گی۔ بڑی مشکل سے اسے لے کر آپ کے پاس پہنچا ہوں میری آپ سے یہ بھی گذارش ہے کہ کمل کانت نام کا ایک اور امیدوار کافی پھُرتیاں مارتا ہے۔ اُس کا انتخاب نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ میری تمام پلاننگ خاک میں مل جائے گی''

منوج اگروال ایک ماہر تاریخ کی حیثیت سے کئی انٹرویوز میں ایک حق وانصاف

پرست کے طور پر شرکت کر چکے تھے۔ عدل وانصاف کا جذبہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے چترنجن باسو کی باتیں سُنیں تو اُن کے چہرے پہ رنجیدگی کے آثار اُبھر آئے۔ انہوں نے کہا۔

''باسو صاحب! کمل کانت نے اگر فارم بھرا ہے تو اُس کی سلیکشن کی جانی چاہیے۔ وہ ایک مستحق امیدوار ہے۔ کمل کانت کو ہم تیس برس سے ہسٹری کے اہم اور معیاری رسائل میں پڑھتے آرہے ہیں۔ کمل کانت نے ہندوستان کی جدید تاریخ پر جو کام کیا ہے وہ آج تک کسی سے نہیں ہوسکا ہے۔ لہٰذا یہ میرے ضمیر اور اصول کے خلاف ہے بلکہ ایک بڑا ظُلم ہے کہ حق والے کو اُس کا حق نہ دلایا جائے''۔

چترنجن باسو کے چہرے پر جو رونق تھی وہ منوج اگروال کی باتیں سُن کر فوراً غائب ہوگئی ادھر خیالو رام کا مُنہ بھی سُوکھ رہا تھا۔ چترنجن باسو منت سماجت پر اُتر آیا اُس نے منوج اگروال کی ٹھوڑی پکڑتے ہوئے کہا۔

''اگروال صاحب! اک بار میرا کہا مان لیجئے۔ میری لاج رکھ لیجئے۔ کمل کانت کا ہم سب آگے ضرور خیال رکھیں گے'' چترنجن باسو نے ٹھوڑی سے ہاتھ اُٹھایا تو اگروال کے پاؤں پکڑ لیے منوج اگروال نے بادل ناخواستہ کہہ دیا۔

''اچھا دیکھ لیتے ہیں''

چترنجن باسو کے حواس بحال ہوئے۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور رُخصت لے کر ہم تینوں آدمی منوج اگروال کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے دوسرے مہمان کے کمرہ نمبر ۴۳۶ کی بیل بجائی تو اندر سے ایک بارعب شخص نے دروازہ کھولا۔ اُسے دیکھتے ہی چترنجن باسو فوراً آگے بڑھا اور اُس سے لپٹتے ہوئے کہنے لگا۔

''کلدیپ سنگھ جی! کیا حال ہے؟ کیسے رہے کسی طرح کی کوئی پریشانی تو نہیں آئی''

کلدیپ سنگھ بولے ''باسو صاحب! ابھی تک تو سب اچھا ہے آگے کیا پتا، سب اوپر والے کا کرم ہے، آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی بھی پریشانی نہیں ہوسکتی ہے ابھی ہم نے کھانا وغیرہ کھالیا ہے۔ بس آرام کرنے کی خواہش رکھتے ہیں''۔

چترنجن باسو نے کہا

''آپ ہمارے مہمان ہیں، آپ آرام کیجئے بہر حال چند اہم باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو دار العلوم کے سر پرست اعلیٰ نے یہاں بحیثیت ماہر تاریخ اسسٹنٹ پروفیسری کے انٹرویو کیلئے بلایا ہے۔ لہذا آپ سے مجھے پوری اُمید ہے کہ آپ میرا بھرپور ساتھ دینگے، میری مراد اس شخص کی سلیکشن سے ہے'' چتر نجن باسو نے اپنی ٹیڑھی انگلی سے خیالو رام کی طرف اشارہ کیا' پھر اُس نے کہا

''اس انٹرویو میں کمل کانت نام کا ایک اور امیدوار انٹرویو دینے آرہا ہے میں چاہتا ہوں کہ اُس کی سلیکشن نہ ہو، اُس کے بدلے میں اپنے خیالو رام کو آگے لانا چاہتا ہوں۔ لہذا خیالو رام کا خیال رکھئے'' چتر نجن باسو کی باتیں سُن کر کلدیپ سنگھ تلملا اُٹھے، اُنہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی بچھو نے اُن کی چھاتی پہ ڈنک مارا ہو وہ کہنے لگے۔

''باسو صاحب! مجھے آپ سے یہ اُمید نہ تھی کہ آپ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنے کا مزاج رکھتے ہیں اور مجھے بھی ایسا ہی کہنے پر مجبور کریں گے۔ میں جہاں کہیں بھی آج تک سلیکشن کمیٹی میں گیا ہوں میں نے حقدار کو اُس کا حق دلایا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ خیالو رام کو اس انٹرویو میں آگے لانا چاہتے ہیں اور کمل کانت کو پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں تو یہ آپ اُس پر ظُلم کر رہے ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ کمل کانت کی کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تاریخ کے دقیق موضوعات پہ اُس کی تحقیق نے نئی جہات مرتب کی ہیں۔ اُس کی زبان اس کے موضوعات اور اُس کی علمی بصیرت کا باسو صاحب میں بہت قائل ہوں۔ یہ وہی کمل کانت ہے جس کے تاریخی مضامین نہ صرف ہندوستان میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، کینیڈا، اٹلی، جرمنی، ناروے، ابوظہبی، برطانیہ، یورپ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی داد و تحسین وصول کرتے ہیں''

چتر نجن باسو نے فوراً کلدیپ سنگھ کے پیر پکڑ لئے اور کہنے لگا۔

''آپ سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ خیالو رام کا ہم سب نے اس لئے خیال رکھنا ہے کیونکہ یہ نہایت مفلس ہے اور اس میں خدمت کا جذبہ بھی بہت زیادہ ہے''۔

کلدیپ سنگھ نے کچھ توقف کے بعد مجبوراً کہا ''بھگوان پہ بھروسہ رکھیں''۔

چتر نجن باسو نے اطمینان کی سانس لی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور

پرست کے طور پر شرکت کر چکے تھے۔ عدل وانصاف کا جذبہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے چترنجن باسو کی باتیں سُنیں تو اُن کے چہرے پہ رنجیدگی کے آثار اُبھر آئے۔ انہوں نے کہا۔

''باسو صاحب! کمل کانت نے اگر فارم بھرا ہے تو اُس کی سلیکشن کی جانی چاہیے۔ وہ ایک مستحق امیدوار ہے۔ کمل کانت کو ہم تیس برس سے ہسٹری کے اہم اور معیاری رسائل میں پڑھتے آرہے ہیں۔ کمل کانت نے ہندوستان کی جدید تاریخ پر جو کام کیا ہے وہ آج تک کسی سے نہیں ہوسکا ہے۔ لہذا یہ میرے ضمیر اور اصول کے خلاف ہے بلکہ ایک بڑا ظلم ہے کہ حق والے کو اُس کا حق نہ دلایا جائے''۔

چترنجن باسو کے چہرے پر جو رونق تھی وہ منوج اگروال کی باتیں سُن کر فوراً غائب ہوگئی ادھر خیالو رام کا مُنہ بھی سُوکھ رہا تھا۔ چترنجن باسو منت سماجت پر اُتر آیا اُس نے منوج اگروال کی ٹھوڑی پکڑتے ہوئے کہا۔

''اگروال صاحب! اک بار میرا کہا مان لیجئے۔ میری لاج رکھ لیجئے۔ کمل کانت کا ہم سب آگے ضرور خیال رکھیں گے''، چترنجن باسو نے ٹھوڑی سے ہاتھ اُٹھایا تو اگروال کے پاؤں پکڑ لیے منوج اگروال نے بادل ناخواستہ کہہ دیا۔

''اچھا دیکھ لیتے ہیں''

چترنجن باسو کے حواس بحال ہوئے۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور رُخصت لے کر ہم تینوں آدمی منوج اگروال کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے دوسرے مہمان کے کمرہ نمبر ۴۳۶ کی بیل بجائی تو اندر سے ایک بارعب شخص نے دروازہ کھولا۔ اُسے دیکھتے ہی چترنجن باسو فوراً آگے بڑھا اور اُس سے لپٹتے ہوئے کہنے لگا۔

''کلدیپ سنگھ جی! کیا حال ہے؟ کیسے رہے کسی طرح کی کوئی پریشانی تو نہیں آئی''

کلدیپ سنگھ بولے ''باسو صاحب! ابھی تک تو سب اچھا ہے آگے کیا پتا، سب اوپر والے کا کرم ہے، آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی بھی پریشانی نہیں ہوسکتی ہے ابھی ہم نے کھانا وغیرہ کھالیا ہے۔ بس آرام کرنے کی خواہش رکھتے ہیں''۔

چترنجن باسو نے کہا

''آپ ہمارے مہمان ہیں، آپ آرام کیجئے بہر حال چند اہم باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو دار العلوم کے سرپرست اعلیٰ نے یہاں بحیثیت ماہر تاریخ اسسٹنٹ پروفیسری کے انٹرویو کیلئے بلایا ہے۔ لہٰذا آپ سے مجھے پوری اُمید ہے کہ آپ میرا بھرپور ساتھ دینگے، میری مراد اس شخص کی سلیکشن سے ہے'' چترنجن باسو نے اپنی ٹیڑھی انگلی سے خیالو رام کی طرف اشارہ کیا' پھر اُس نے کہا

''اس انٹرویو میں کمل کانت نام کا ایک اور امیدوار انٹرویو دینے آرہا ہے میں چاہتا ہوں کہ اُس کی سلیکشن نہ ہو، اُس کے بدلے میں اپنے خیالو رام کو آگے لانا چاہتا ہوں۔ لہٰذا خیالو رام کا خیال رکھئے'' چترنجن باسو کی باتیں سُن کر کلدیپ سنگھ تلملا اُٹھے، اُنہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی بچھو نے اُن کی چھاتی پہ ڈنک مارا ہو وہ کہنے لگے۔

''باسو صاحب! مجھے آپ سے یہ اُمید نہ تھی کہ آپ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنے کا مزاج رکھتے ہیں اور مجھے بھی ایسا ہی کہنے پر مجبور کریں گے۔ میں جہاں کہیں بھی آج تک سلیکشن کمیٹی میں گیا ہوں میں نے حقدار کو اُس کا حق دلایا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ خیالو رام کو اس انٹرویو میں آگے لانا چاہتے ہیں اور کمل کانت کو پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں تو یہ آپ اُس پر ظلم کر رہے ہیں۔ آپ یقین کیجئے کہ کمل کانت کی کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تاریخ کے دقیق موضوعات پہ اُس کی تحقیق نے نئی جہات مرتب کی ہیں۔ اُس کی زبان اس کے موضوعات اور اُس کی علمی بصیرت کا باسو صاحب میں بہت قائل ہوں۔ یہ وہی کمل کانت ہے جس کے تاریخی مضامین نہ صرف ہندوستان میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، کینیڈا، اٹلی، جرمنی، ناروے، ابوظہبی، برطانیہ، یورپ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی دادو تحسین وصول کرتے ہیں''

چترنجن باسو نے فوراً کلدیپ سنگھ کے پیر پکڑ لئے اور کہنے لگا۔

''آپ سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ خیالو رام کا ہم سب نے اس لئے خیال رکھنا ہے کیونکہ یہ نہایت مفلس ہے اور اس میں خدمت کا جذبہ بھی بہت زیادہ ہے''۔

کلدیپ سنگھ نے کچھ توقف کے بعد مجبوراً کہا'' بھگوان پہ بھروسہ رکھیں''۔

چترنجن باسو نے اطمینان کی سانس لی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور

رُخصت لے کر ہم تینوں کمرے سے باہر آئے۔ اب ہم کمرہ نمبر ۲۴۳ کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے آہستہ سے بیل کے بٹن پہ انگلی دبا دی اندر کمرے میں ایک سریلی آواز گونج اُٹھی اندر سے ایک عمر رسیدہ شخص نے دروازہ کھولا۔ انہیں دیکھ کے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ عمر رفتہ کو آواز دے رہے ہوں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''سنایئے قبلہ کیسے آنا ہوا''؟

میں نے کہا ''چترنجن باسو آپ سے ملنے آئے ہیں، آپ اُن کے مہمان ہیں'' تب تک چترنجن باسو فوراً آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

''کندن لال جی! آداب! سُنایئے کیسے ہیں؟ فون پہ تو آپ سے بات ہوئی تھی مگر آپ کو دیکھنے کی چاہت مجھے اس وقت یہاں لے آئی۔ آپ سے میری ملاقات پہلی بار ہو رہی ہے''

کندن لال نے کہا

''اچھا آپ چترنجن باسو ہیں!''

''جی ہاں میں ہی چترنجن باسو ہوں''

کندل لال نے ڈوبتی اُبھرتی آواز میں کہا ''ارے بھائی! ابھی تو تم جوان ہو۔ ہمارے دن تو بیت گئے۔ بس آپ کے یہاں سے ہمیں بلا لیتے ہیں تو ہم بھی چلے آتے ہیں''

چترنجن باسو نے کہا

''کندن لال جی! میرے لائق کوئی سیوا ہو تو کہیے''

''ارے بھائی! ہم کیا بتائیں۔ ہمیں تو آپ کی سیوا کیلئے بھیجا گیا ہے''

کندن لال کی زبانی اُن کا یہ جملہ سُن کر چترنجن باسو کی جان میں جان آگئی تب اُس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اُس نے کہا

''کندن لال جی! بھگوان آپ کی عمر لمبی کرے! بہت تعریفیں آپ کے بارے میں سُن چکا ہوں۔ بس میری آپ سے ایک التجا ہے وہ یہ کہ آپ دیکھ رہے ہیں میرے ساتھ یہ دُبلا پتلا سانولے رنگ کا جوان کھڑا ہے، اسے خیالو رام کہتے ہیں۔ کل اس کا انٹرویو ہے، آپ ہی جیسے بھگوان کے پیارے انٹرویو لے رہے ہیں۔ میری تڑپ اور آرزو یہ ہے کہ

خیالو رام کی سلیکشن ہو اور کمل کانت نام کا ایک اور امیدوار امید لگائے بیٹھا ہے۔ اُس کی سلیکشن نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے اندر ہی اندر اُس کا خوف کھائے جا رہا ہے۔ لہٰذا اس بات کا خیال رکھیں۔ میری رائے یہ ہے کہ خیالو رام سے آپ کل انٹرویو میں جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں وہ سب اسے ابھی بتا دیجئے اور کوشش کیجئے کہ اس کا نام، تاریخِ پیدائش، ابتدائی تعلیم، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اور زیادہ سے زیادہ اگر پوچھنا بھی چاہیں تو یہ پوچھئے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع کیا تھا اور اگر موضوع کے اندر آپ اسے گھسا دیں گے تو اس کم زبان کی زبان لڑکھڑا جائے گی۔ لہٰذا اس پہ رحم کیجئے۔ دوسری بات یہ کہ کمل کانت سے ایسے ایسے سوالات پوچھئے گا کہ بچو کو نانی یاد آئے اور اُس کا دماغ چکرانے لگ جائے"

کندن لال نے زور سے قہقہہ مارا اور کہنے لگے "چترنجن باسو صاحب! آپ خوش رہیے میں آپ کی تمنا پوری کروں گا۔ آپ ہمارا بھی خیال رکھیئے۔ خیالو رام کا خیال میں رکھوں گا۔ اُس کی سلیکشن کروا کے نہ گیا تو میرا نام بھی کندن لال نہیں۔ رہی بات کمل کانت کی تو اُس کی فکر چھوڑ دیں۔ اُس سے میں وہ سوالات پوچھوں گا کہ جن کے جوابات اُس کے فرشتے بھی نہیں دے پائیں گے۔ ظاہر ہے آپ بھی انٹرویو کمیٹی میں موجود ہوں گے سب کچھ اپنی آنکھوں دیکھ لیں گے"۔

چترنجن باسو اور خیالو رام کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے۔ کندل لال سے اُنہیں ایسی اُمید نہ تھی مگر وہ تو واقعی کندن نکلے۔ چترنجن باسو نے خوشی کے جوش میں کندل لال کو گلے سے لگایا۔ خوب بھینچا اور کہنے لگا۔

"کندن جی! آپ سدا سکھی رہیں!" یہ کہتے ہوئے چترنجن باسو اور خیالو رام نے ہاتھ جوڑے اور رخصت ہونے لگے تو کندن لال نے خیالو رام کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہنے لگے۔

"جاؤ بیٹا! کل دیکھا جائے گا تم خوش رہو"

ہم تینوں کمرے سے باہر آئے تو میں نے چترنجن باسو کو خیالو رام سے الگ لے جا کر تنہائی میں اپنی جگہ پوچھا "باسو صاحب! آپ اس خیالو رام کے لئے کیوں اتنا تڑپ رہے ہیں، وجہ کیا ہے؟ میں تو حیران رہ گیا! یہ چکر کیا ہے؟"

چترنجن باسو نے بڑے اطمینان سے کہا

''نریش رانا صاحب! میرے پاپوش کے تسمے کھولنے اور باندھنے سے لے کر میرے مکان میں پوچھ پھیرنے تک کون سا ایسا کام ہے جو خیالو رام نے نہیں کیا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے میں اس کا خیال نہ رکھوں تو کس کا رکھوں؟ اور پھر اتنی ہی بات نہیں ہے، بلکہ اس نے تو اپنی جمع پونجی بھی میرے نام بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دی ہے۔ اب آپ ہی کہیے کیسے انکار کروں؟''

میں نے پوچھا کتنی جمع پونجی''؟ چترنجن باسو نے اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں میرے سامنے کھڑی کر دیں اور کہنے لگا۔

''رانا صاحب! آپ سے کوئی بھی بات چھپانا مہا پاپ سمجھتا ہوں''

جب میں چترنجن باسو کی باتیں سُن کر ہکا بکا رہ گیا تو اُس نے کہا

''اچھا رانا صاحب! اب ہم چلتے ہیں آپ کو ہم نے کافی تکلیف پہنچائی معاف کیجئے گا''۔ یہ کہتے ہوئے چترنجن باسو اور خیالو رام میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کمل کانت اس کے بعد۔۔۔ تیرا انٹرویو کیسا ہوا تھا۔ وہ میں تجھ سے سُننا چاہتا ہوں''۔

''رانا صاحب! آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ میں تعلیمی اعتبار سے اس وقت بھی اوّل نمبر پر ہوں۔ میں ایم اے ہسٹری۔ بی ایڈ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ نیٹ اور ڈی۔ ایچ یعنی ڈاکٹر آف ہسٹری بھی ہوں۔ اس کے علاوہ بارہ کتابوں کا مصنف ہونے کے علاوہ سینکڑوں تاریخی مضامین ملک اور بیرون ملک کے اہم تاریخی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں جنہیں تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں نے کافی پسند کیا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے انٹرویو کی ڈرامابازی میں کیا پوچھا گیا وہ سنیئے:

میں تین مہینے سے مسلسل انٹرویو کی تیاری کرتا رہا۔ میری آنکھوں کی بینائی لکھتے پڑھتے کمزور ہو گئی۔ ہندوستانی تاریخ کی بہت سے کتابوں کو میں نے پڑھ ڈالا تھا اور جس دن میرا انٹرویو تھا اُس دن جولائی کی ۲۳ تاریخ تھی۔ گرمی اپنے پُورے شباب پر تھی۔ دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کے آفس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑے ہال میں بہت سے امیدوار اونچی نرم کرسیوں پر بیٹھے خوف و امید کے درمیان جھول رہے تھے اور جونہی دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کے کمرے سے کوئی امیدوار انٹرویو دے کے آتا تو بقیہ

امیدوار اس کے اردگرد ایسے جمع ہو جاتے کہ جیسے وہ چار دھام کر کے آیا ہو۔ سب باری باری اُسے پوچھتے ''سنائیے آپ سے کیا پوچھا گیا؟'' وہ اپنا حال بیان کرتا۔ کچھ کو تسلی ملتی کچھ حیران رہ جاتے۔ رانا صاحب! جب میرا نمبر آیا تو اپنے ضروری دستاویزات تو میں نے خود اُٹھائے لیکن کتابیں اور رسائل اُٹھانے کیلئے میں نے دو آدمیوں کی مدد مانگی۔ میرے ساتھ دو چپڑاسیوں کو بھیجا گیا، جنہوں نے بڑی مشکل سے میری تصنیف کردہ تاریخی کتابیں اور میرے درجنوں وہ تاریخی رسائل و جرائد اُٹھائے جن میں میرے تاریخی مضامین شائع ہوئے تھے۔ میں نے دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کے کمرے میں بھگوان کا نام لے کر قدم رکھا تو اندر تقریباً تیرہ آدمیوں کی ایک ٹیم میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے آداب کا پاس ولحاظ رکھا اور سامنے پڑی ایک کرسی پہ بیٹھ گیا۔ سب کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ چترنجن باسو بھی میرے پرسکون چہرے کو دیکھ کے نہایت متفکر بیٹھا تھا مجھے میرے انٹرویو لینے والے ماہرین تاریخ کی طرف رُخ کرنے کر کہا گیا۔ تین آدمی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جن میں دو ادھیڑ عمر کے تھے، دونوں کے چہروں پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ تیسرا آدمی بوڑھا تھا۔ عمر میرا خیال ہے اسی برس کے آس پاس کی معلوم ہو رہی تھی۔ کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ اسی ایک شخص نے مجھے کل چار سوال پوچھے جن کا میرے مضمون اور موضوع سے کوئی بھی تعلق نہ تھا۔

پہلا سوال۔ ''ڈاکٹر کمل کانت میرا پہلا سوال آپ سے یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی کا سائز کیا تھا یعنی اُس کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کتنی تھی؟''

یہ تو میں جانتا تھا کہ حضرت نوحؑ نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو خدا کا تعارف کروایا اور جب قوم باغی و سرکش ہو گئی تو بحکم خدا حضرت نوحؑ نے کشتی تیار کروائی جس میں ہر جاندار کا جوڑا سوار ہوا باقی جو سوار نہیں ہوئے اُن کو خدا نے غرقاب کر دیا لیکن نوحؑ کی کشتی کا سائز! میں نے خاموشی اختیار کی، مجھ سے کوئی بھی جواب نہ بن پڑا۔

دوسرا سوال۔ ''ڈاکٹر کمل کانت آپ پہلے سوال کا جواب نہیں دے پائے ہیں۔ میرا دوسرا سوال آپ سے یہ ہے کہ دُنیا میں پہلے مرغی آئی یا انڈا''؟

میں نے دل ہی دل میں سوچا آخر یہ شخص مجھے اس طرح کے سوالات پوچھ کے

کیوں پریشان کر رہا ہے! میں خاموش رہا۔ لمحہ بھر تک مرغی اور انڈا ایک ساتھ میرے ذہن میں گردش کرتے رہے!

تیسرا سوال۔ ''ڈاکٹر کمل کانت یہ بتایئے کہ شاہجہاں اور ممتاز بیگم کی قبروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے''؟

یہ تو میرے علم میں تھا کہ تاج محل دنیا کے عجائبات میں سے ایک بہترین عجوبہ ہے اور شاہجہاں نے اسے اپنی بیگم ممتاز کی فرمائش پہ تعمیر کروایا تھا جو یادگار محبت کا ایک عظیم شاہکار ہے لیکن شاہجہاں اور ممتاز بیگم کی قبروں کے درمیان فاصلہ! اس کا تو مجھے علم نہیں ہے۔ میں جواب نہیں دے سکا!

چوتھا سوال۔ ''ڈاکٹر کمل کانت! ابھی تک آپ میرے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے پائے ہیں اب آپ سے میرا آخری سوال یہ ہے کہ حشراتُ الارض میں کون سا کیڑا سب سے پہلے گرمی کے موسم میں زمین کے اندر سے باہر آتا ہے اور کون سا کیڑا سردی کے موسم میں سب سے پہلے زمین کے اندر چلا جاتا ہے''؟

میرے دل میں جب غم و غصے کی ایک لہر سی اُٹھی تو میں نے اُس بوڑھے ماہر تاریخ کو کہہ دیا ''جناب میری معلومات کیلئے آپ ہی مجھے ان سوالوں کے جوابات بتا دیجئے''۔ اُس کے بوڑھے چہرے پر ندامت کی ایک شکن سی اُبھری اور کہنے لگا ''اگر میں نے ان سوالوں کے جوابات دینے ہوتے تو ڈاکٹر کمل کانت! تمہیں یہاں آنے کی زحمت کیوں دی جاتی''

رانا صاحب! جب میرے بدن کا ایک ایک انگ کاٹا جا رہا تھا تو میرے لہولہان وجود کو دیکھ کے چترنجن باسو ہنس رہا تھا۔ پھر دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ نے کہا ڈاکٹر کمل کانت! اب آپ چلے جایئے گا''۔ میں نے اپنا مجروح وجود کو سمیٹا اور جونہی میں اپنی کتابیں اور رسائل یکجا کرنے لگا تو چترنجن باسو نے کہہ دیا۔ ''کتابوں میں کیا رکھا ہوتا ہے؟ اُمیدوار انٹرویو میں بولنا چاہیے''۔ اُس کا یہ جملہ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام کر گیا۔ مزید یہ کہ میرے بعد اب خیالو رام کی باری تھی۔ اُس کے پاس اپنے کھوکھلے وجود کے سوا یہ تمام چیزیں نہیں تھیں لہذا اُسے تحفظ فراہم کرنے کے لئے چترنجن باسو راہ ہموار کر رہا تھا۔ اس

طرح کتاب کی عظمت، اہمیت و افادیت اور مصنف کا راتوں کی نیند حرام کر کے اپنا لہو جلانے کو کارلوفراں تصور کیا گیا! رانا صاحب! انٹرویو والے دن ہی تقریباً رات کے قریب آٹھ بجے خیالو رام کا نام اسسٹنٹ پروفیسری کے لئے ہوا میں گردش کرنے لگا اور پھر کچھ ہی دن کے بعد خیالو رام نے شعبۂ تاریخ میں اسسٹنٹ پروفیسری کی پوسٹ پہ جوائن کر لیا تھا! یعنی چترنجن باسو اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا تھا!

''رانا صاحب! آپ میری باتیں سُن رہے ہیں نا''؟

''ہاں کمل کانت! سُن رہا ہوں''

''رانا صاحب! زندگی میں پہلی بار میرے تجربے اور مشاہدے میں یہ بات آئی کہ ہم پیالہ وہم نوالہ والوں کی دوستی فولاد کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ باقی تمام دوستیاں یہاں تک کہ قریبی رشتے بھی اُس غبارے کی مانند ہوتے ہیں جس میں ہوا بھری ہو اور ہاتھ پھیرنے پر اُس سے تنتناہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے لیکن جونہی اُسے معمولی سا کیل یا کانٹا چُبھتا ہے تو پھُس کر کے اپنی موت کا اعلان کر دیتا ہے۔''

نریش رانا نے استدلالی انداز میں کمل کانت کو سمجھایا۔

''کمل کانت! جب دُکاندار اپنے گاہک کو ماچس کی ڈبیہ یا صابن کی ٹکیہ مفت میں نہیں دیتا ہے تو تجھے کیا اتنی بڑی اسسٹنٹ پروفیسری محض تیری ذہانت اور قابلیت کی بنیاد پہ مل جاتی! تجھے پتا ہونا چاہیے دو لاکھ روپے سے یہ سودا شروع ہوا تھا اور پانچ لاکھ پہ ختم ہوا ہے! اچھا یہ بتا کہ دارالعلوم کا سرپرست اعلیٰ بھی تجھے تیرا حق نہیں دلا سکا؟ کہتے ہیں کہ دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت ایک بادشاہ کی سی ہوتی ہے''؟

کمل کانت نے جواب دیا

''رانا صاحب! اس میں کوئی شک نہیں کہ دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت ایک بادشاہ کی سی ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو چھوٹے ملازموں سے لے کر بڑے ملازموں تک سب سے رات بھر کھڑے کھڑے کام لے سکتا ہے اور چاہے تو دن کو اُنہیں آرام کروا سکتا ہے۔ دارالعلوم کے کسی انٹرویو میں اگر وہ اُڑ جائے تو مستحق امیدوار کو حق دلائے بغیر نہیں

رہتا۔ اس صورت میں منتری سے لے کر پردھان منتری تک کی تمام سفارشیں دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ کی رہائش گاہ کی دیواروں سے سر ٹکراتی ہوئی اُس کے کوڑے دان میں مُنہ کے بل گر جاتی ہیں لیکن اس بار اُس کی حیثیت ایک ڈرامابیں سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے چترنجن باسو نے اُسے پہلے ہی گدگدی کر کے ہنسا لیا ہو۔

"رانا صاحب! ایک اور اہم بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے ہر فعل بد کو نوشتۂ تقدیر خیال کرتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر جدھر مرضی اُدھر پھریں یہ سب اُن کے مقدر میں لکھا ہوا ہے یعنی ان کے خیال میں تمام بُرے کام بھگوان کرواتا ہے، ایسے لوگوں نے تو مقدر کو چار سینگوں والی بکری سمجھ رکھا ہے کہ دو سینگ اگر اُس کے ٹوٹ جائیں دو تو کام کریں گے نا۔ یا پھر یہی وہ لوگ ہیں جو اُردو کے ایک بڑے شاعر اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کا کچومر نکالنے کی کوششیں کرتے ہیں"۔

نریش رانا نے کمل کانت کی باتوں کی تصدیق کرتے ہوئے کہا

"کمل کانت تو صحیح کہہ رہا ہے۔ دُنیا میں زیادہ تر اسی طرز فکر کے لوگ ہیں"۔

"رانا صاحب! کبھی کبھی بہت زیادہ جذباتی ہو جاتا ہوں اور تب میرا جی چاہتا ہے کہ میں آتم ہتیا کروں! آپ کا کیا خیال ہے"؟

نریش رانا چونک گئے وہ کسی حد تک اپنی کُرسی پہ اُوچھل کے بیٹھ گئے اور بڑے متعجب انداز میں کہنے لگے۔

"کیا ----------- آتم ہتیا! ------- کمل کانت! آتم ہتیا تو وہ لوگ کرتے ہیں جو لاعلم ہوتے ہیں، جاہل ہوتے ہیں یا پھر بزدل ہوتے ہیں۔ تو تُو صاحب علم ہے۔ کیا تو آتم ہتیا کر کے بھگوان کو ناراض کرنا چاہتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسا بُرا خیال اپنے ذہن سے نکال دینا!"

کمل کانت نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا

"رانا صاحب! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آتم ہتیا کرنا جاہلوں اور بزدلوں کا کام ہے تو کیوں نہ پھر آتنک وادی گروپ میں شامل ہو جاؤں! اس بارے میں آپ کی کیا رائے

ہے''؟ کمل کانت! آتنک وادی گروپ میں شامل ہونے کی تیری عمر نہیں رہی ہے اور پھر آتنک وادیوں کا حال بھی تیرے سامنے ہے!''

''رانا صاحب! اگر آپ یہ بھی نہیں چاہتے ہیں تو پھر میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میں اپنی تمام کتابیں اور رسائل کہ جو میرا عمر بھر کا اثاثہ ہے، کسی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا میں پھینک آؤں؟ تا کہ آئندہ مجھے کسی دارالعلوم کے انٹرویو کیلئے یہ منوں بوجھ اپنے کندھوں پہ نہ اُٹھانا پڑے''۔

نریش رانا کا ماتھا کمل کانت کی ناگوار باتیں سُن کر شکن آلود ہو گیا، انہوں نے تُنک کر کہا'' کمل کانت! تُو مجھ سے یہ کیسی باتیں کر رہا ہے! ان کتابوں کا کیا قصور ہے؟ ان کتابوں کے ذریعے تو تُو لاکھوں بلکہ کروڑوں دلوں کے اندر اپنی عظمت اور وقار قائم کر چکا ہے اور کیا تو یہ نہیں جانتا ہے کہ قلم کار قوم کی امانت ہوتا ہے۔ ان تمام فتنہ پرور باتوں کو اپنے ذہن سے نکال دے''۔

آخر کار کمل کانت نے اپنی بے بسی اور مجبوری سے مغلوب ہو کر باآواز بلند پوچھا۔'' تو رانا صاحب! پھر کیا کروں۔۔۔۔ کہاں جاؤں؟ میرے دل کی بے قراری تو مسلسل بڑھتی جا رہی ہے! مجھے کوئی بہترین مشورہ تو دیجئے''۔

نریش رانا نے مسّرت آمیز لہجے میں کہا

''کمل کانت! تو بے غم رہ میں تجھے ایک بہترین مشورہ دے رہا ہوں جس پہ عمل کرنے سے تجھے اطیمنان قلب نصیب ہوگا۔ تجھے نہ تو آتم ہتیا کرنی ہے، نہ آتنک وادی گروپ میں شامل ہونا ہے اور نہ ہی اپنی کتابیں اور رسائل دریا میں پھینکنے ہیں بلکہ میں تجھے اتنا آسان، موثر اور مفید مشورہ دے رہا ہوں کہ تو بھی کیا یاد کرے گا''

نریش رانا کی باتیں سُن کر کمل کانت کے مرجھائے ہوئے دل کی تمام کلیاں کھل اُٹھیں، چہرے پہ نکھار سا آ گیا۔ اُس نے بڑی بے صبری سے پوچھا

''رانا صاحب! آپ کا وہ بہترین مشورہ ہے کیا؟''

نریش رانا نے کہا

''کمل کانت میرا وہ بہترین مشورہ یہ ہے کہ تُو پرماتما کے آگے ہاتھ اُٹھا دے

کیونکہ ایک روز یہاں پڑوس کی جامع مسجد میں مولوی اکبر علی جمعہ کے دن لوگوں کے بھاری مجمع میں کہہ رہے تھے کہ تین آدمیوں کی دعا خدا ردّ نہیں کرتا، ایک عادل بادشاہ کی، دوسرے اُس شخص کی جو راہِ خدا میں ہو اور تیسرے مظلوم کی۔

کمل کانت تیرا حق تجھ سے چھینا گیا ہے! اس لئے تو مظلوم ہے"۔

کمل کانت پوری بات سمجھ گیا، اس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔ اس نے کہا رانا صاحب! آپ نے واقعی مجھے بہترین مشورہ دیا بلکہ ایک طرح کی خوش خبری سنائی، میں زندگی کے آخری لمحے تک اِس بہترین مشورہ پر عمل پیرا رہوں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!"

نریش رانا نے ٹیبل بیل بجائی اور خادم فوراً اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے اُسے جوس دو گلاسوں میں لانے کو کہا۔ کچھ ہی لمحوں میں خادم جوس لے کر آ گیا۔ نریش رانا نے اپنا گلاس اُٹھاتے ہوئے کمل کانت کو کہا

"میرے بھائی! جوس پی لے اور زندگی میں خوش رہنا سیکھ لے"

"جی رانا صاحب! آپ بجا فرما رہے ہیں ایسا ہی کروں گا"

جوس پینے کے بعد نریش رانا اور کمل کانت آپس میں بغل گیر ہوئے اور کمل کانت نریش رانا سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

"رانا صاحب! بھگوان کرے ہمارا یہ بھائی بھائی کا سارشتہ سدا قائم و دائم رہے!" کمل کانت بہت خوش تھا اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کے دل و دماغ پر سے منوں بوجھ اُتر گیا ہو۔

جب کمل کانت اپنے گھر پر پہنچا تو اُس نے ایک مخصوص وقت میں ایکیس (۲۱) دن تک جاپ کیا، ایک وقت کا کھانا کھایا۔ گھر کے گوشۂ تنہائی میں نہ جانے وہ بھگوان سے کیا کچھ مانگتا رہا۔ بالآخر اُس کی آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کو بھگوان کے دربار میں شرف قبولیت حاصل ہو گیا۔ اِدھر کمل کانت کا جاپ پورا ہوا، اُدھر چترنجن باسو کے ہاتھوں اور پیروں میں بے حسی پیدا ہو گئی جو مسلسل بڑھتی چلی گئی اور پھر جب وہ شہر کے مشہور ماہر امراض ڈاکٹر یوگیشور کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے اُسے بڑے دکھی لہجے میں کہا

"باسو صاحب! آپ کے جسم میں کوڑھ کی بیماری نے ڈیرہ ڈال دیا ہے!"

■❖■

ممتاز ادیب

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک نظر میں

ڈاکٹر دلجیت ورما پروفیسر (اردو)
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین گاندھی نگر جموں (توی)
موبائل نمبر: 09419150556

1۔ نام: مشتاق احمد وانی

2۔ والد کا نام: محمد اسد اللہ وانی (مرحوم)

3۔ والدہ کا نام: مہتاب بیگم (مرحومہ)

4۔ جائے پیدائش: محلہ سروال۔ گاوں بہوتہ، علاقہ۔ مرمت، تحصیل و ضلع ڈوڈہ۔ ریاست۔ جموں کشمیر (ہندوستان)

5۔ اصل تاریخ پیدائش: 3 مارچ 1963ء اسکول ریکارڈ کے مطابق 3 مارچ 1960ء

6۔ تعلیم کا آغاز: سینٹرل اسکول بہوتہ سے ہوا۔

7۔ میٹرک کا امتحان: 1980 میں گورنمنٹ ہائی اسکول گوہا (مرمت) سے پاس کیا۔

8۔ بی۔اے کا امتحان: گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ (ضلع ڈوڈہ) سے 1985ء میں پاس کیا۔

9۔ ایم۔اے (اردو): جموں یونیورسٹی جموں (توی) سے 1988ء میں۔

10۔ پی۔ایچ۔ڈی: 1999ء میں جموں یونیورسٹی سے۔ محترم عالی جناب گریش چندر سکسینہ گورنر ریاست جموں کشمیر کے ہاتھوں تفویض کی گئی۔

11۔ NET نیٹ: 2001ء میں جموں یونیورسٹی کے تحت۔

12۔ بی ایڈ: 2003ء میں جموں یونیورسٹی کے تحت۔

13۔ ڈی لٹ 2012ء میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی (یو پی) سے محترم عالی جناب بی ایل جوشی گورنر (یو پی) محترم جناب محمد مزمل وائس چانسلر اور محترم جناب نرندرا یادو پلانگ کمشنر آف انڈیا کے ہاتھوں تفویض کی گئی۔

14۔ پی ایچ ڈی کا موضوع: تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران۔

15۔ ڈی لٹ کا موضوع: اردو ادب میں تانیثیت۔

16۔ ادبی زندگی کا آغاز: 1989ء میں ''افسانہ تڑپتے پنچھی'' سے ہوا۔

تصانیف

1۔ ہزاروں غم (افسانے) 2001 میں جے کے آفسیٹ پریس دہلی سے شائع ہوئی۔

2۔ تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران (تحقیق وتنقید) 2002ء میں ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی نے شائع کی۔

3۔ آئینہ در آئینہ (تحقیقی وتنقیدی مضامین) 2004ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے شائع کی۔

4۔ میٹھا زہر (افسانے) 2008ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے شائع کی۔

5۔ اعتبار و معیار (تحقیقی وتنقیدی مضامین) 2011ء میں ایچ ایس۔ آفسیٹ دہلی نے چھاپی۔

6۔ اردو ادب میں تانیثیت (تحقیق وتنقید) 2013ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے شائع کی۔

7۔ شعور بصیرت (تحقیقی وتنقیدی مضامین) 2014ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے شائع کی۔

8۔ اندر کی باتیں (افسانے) 2015ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی کے ذریعے بہت جلد پریس میں جا رہی ہے۔

غیر مطبوعہ تصانیف

1۔ افہام وتفہیم زبان وادب (تحقیقی وتنقیدی مضامین)

2۔ خارستان کا مسافر (خودنوشت سوانح عمری)

3۔ تناظرات وتفکرات (تحقیقی وتنقیدی مضامین)

اعزازات

1۔ افسانہ کلب ملیر کوٹلہ (پنجاب) کی جانب سے 2010ء میں بہترین افسانہ نگار ایوارڈ

2۔ 2011ء میں جموں یونیورسٹی جموں توی نے "مشتاق احمد وانی بحیثیت افسانہ نگار" موضوع پر شکتی دیوی کو ایم فل کی ڈگری تفویض کی۔

3۔ ستمبر 2012ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج کشتواڑ میں کالج کے پرنسپل محترم جناب ڈاکٹر شفقت رفیقی صاحب اور ڈاکٹر طارق تمکین کشتواڑی کی جانب سے منعقدہ ایک ادبی مجلس میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور "جسم خور کیڑا ۔ کہانی" پڑھ کر سنائی۔

4۔ 2013ء میں انگریزی کے معروف مبصر محترم جناب ڈاکٹر للت گپتا نے جموں کشمیر کے معیاری اور مشہور انگریزی روز نامہ "Daily excelsior" میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی تاریخ ساز کتاب Feminism in urdu "Literature" پر ایک بصیرت افروز تبصرہ شائع کروایا۔

5۔ 16 دسمبر 2013 کو عزت مآب جناب این این وہرا گورنر ریاست جموں کشمیر نے اپنے راج دربار میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی معرکتہ الآرا کتاب "اردو ادب میں تانیثیت" کی رسم رونمائی انجام دی۔

6۔ 15 اور 16 مارچ 2014ء کو ملیر کوٹلہ پنجاب میں افسانہ کلب کی جانب سے ایک مومینٹو اور سند پیش کی گئی۔

7۔ 22 جون 2014ء کو مالیگاوں (مہاراشٹر) میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی ممبئی کی جانب سے "وقار ادب" ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

8۔ 2014ء میں اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنو کی جانب سے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی تحقیقی وتنقیدی کتاب "اعتبار و معیار" پر 5000 روپے کا انعام ملا۔

9۔ دسمبر 2014ء کو ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو عربی فارسی اور اردو یونیورسٹی آف مدراس

کی جانب سے ''کاوش بدری ایوارڈ'' سے سرفراز کیا گیا۔

10۔ 2014ء میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو آل جے اینڈ کے ٹیچرس گلڈ کے ادبی سیل کا چیف آرگنائزر نامزد کیا گیا۔

11۔ 10رمئی 2015ء کو افسانہ کلب ملیر کوٹلہ (پنجاب) کی جانب سے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو مومینٹو اور توصیفی سند پیش کی گئ۔

12۔ 2015 میں حیدر آباد یونیورسٹی میں ''مشتاق احمد وانی کی افسانہ نگاری'' کے موضوع پر ارشد احمد کو چھے کو ایم فل کی ڈگری تفویض کی گئی۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی ادبی نگارشات پر مشاہیر ادب کے تاثرات ایک فہرست

1۔ محترم جناب پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی)
2۔ محترم جناب پروفیسر حامدی کاشمیری (سری نگر)
3۔ محترم جناب پروفیسر وہاب اشرفی مرحوم (پٹنہ)
4۔ محترم جناب پروفیسر ظہور الدّین (جموں)
5۔ محترم جناب افتخار امام صدیقی مدیر ماہنامہ 'شاعر' (ممبئ)
6۔ محترم جناب کشمیری لال ذاکر (چنڈیگڑھ)
7۔ محترم جناب پروفیسر قاضی عبید الرحمان ہاشمی (دہلی)
8۔ محترم جناب پروفیسر قمر رئیس مرحوم (دہلی)
9۔ محترم جناب پروفیسر جاوید قدوس (جموں)
10۔ محترم جناب جوگندر پال (دہلی)
11۔ محترم جناب نور شاہ (سرینگر)
12۔ محترم جناب پروفیسر عتیق اللہ (دہلی)
13۔ محترم جناب محمد زماں آزردہ (سرینگر)
14۔ محترم جناب قاضی مشتاق احمد (پونہ)
15۔ محترم جناب پروفیسر مجید بیدار (حیدر آباد)
16۔ محترم جناب مناظر عاشق ہرگانوی (بہار)

17۔ محترم جناب پروفیسر محبوب راہی (مہاراشٹر)

18۔ محترم جناب ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی)

19۔ محترم جناب پروفیسر ارتضیٰ کریم (دہلی)

20۔ محترم جناب علی جاوید (دہلی)

21۔ محترم جناب پروفیسر اسلم جمشید پوری (میرٹھ)

22۔ محترم جناب پروفیسر علی احمد فاطمی (الہ آباد)

23۔ محترم جناب انیس امروہی (دہلی)

24۔ محترم جناب ڈاکٹر شباب للت مرحوم (ہماچل پردیش)

25۔ محترم جناب علیم صبانویدی (مدراس)

26۔ محترم جناب پروفیسر ابوالکلام قاسمی (علیگڑھ)

27۔ محترم جناب محمد بشیر ملیر کوٹلوی (پنجاب)

28۔ محترم جناب دیپک کنول (ممبئی)

29۔ محترم جناب دیپک بدکی (غازی آباد)

30۔ محترمہ سیدہ نسرین نقاش (سری نگر)

31۔ محترم جناب پروفیسر صغیر افراہیم (علیگڑھ)

32۔ محترم جناب پروفیسر ابوالکلام (حیدرآباد)

33۔ محترم جناب احمد عثمانی (مالیگاوں مہاراشٹر)

34۔ محترم جناب نورالحسنین (پونہ)

35۔ محترم جناب رفیق شاہین (علی گڑھ)

36۔ محترم جناب ہارون بی اے (مالیگاوں مہاراشٹر)

37۔ محترم جناب پروفیسر بشیر احمد نحوی (سرینگر)

38۔ محترم جناب پروفیسر شریف احمد قریشی (رام پور)

39۔ محترم جناب حقانی القاسمی (دہلی)

40۔ محترم جناب معین الدین عثمانی (مہاراشٹر)

41۔ محترم جناب رونق جمال (چھتیس گڑھ)

42۔ محترم جناب ابوبکر عباد شعبۂ اُردو (دہلی یونیورسٹی)

43۔ محترم جناب امین بنجارہ (جموں)

44۔ محترم جناب عظیم راہی (مہاراشٹر)

45 محترم جناب پروین کمار اشک (پٹھان کوٹ)

46 محترم جناب ڈاکٹر پرویز شہریار (دہلی)

47۔ محترم جناب محمد شاہد پٹھان (جے پور راجستھان)

48۔ محترم جناب ڈاکٹر پریمی رومانی (جموں)

49۔ محترم جناب ڈاکٹر سید اختیار جعفری (آگرہ)

50۔ محترم جناب ڈاکٹر مجیب شہزر (علیگڑھ)

51۔ محترم جناب ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی (پٹنہ)

52۔ محترم جناب عطا عابدی (پٹنہ)

53۔ محترم جناب ڈاکٹر الطاف انجم اسسٹینٹ پروفیسر فاصلاتی نظام تعلیم (کشمیر یونیورسٹی)

54۔ محترم جناب ڈاکٹر ریاض احمد ریڈر شعبۂ اُردو (جموں یونیورسٹی)

55۔ محترم جناب ڈاکٹر چمن لعل بھگت اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو (جموں یونیورسٹی)

56۔ محترم جناب ڈاکٹر رغبت شمیم ملک (دہلی)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی اردو ادبی رسائل وجرائد میں شمولیت

1۔ ماہنامہ شاعر (ممبئی)

2۔ ماہنامہ اردو دنیا (دہلی)

3۔ ماہنامہ بیباک (مالیگاوں مہاراشٹر)

4۔ ماہنامہ بیسویں صدی (دہلی)

5۔ ماہنامہ شیرازہ (کلچرل اکیڈمی جموں کشمیر)

6۔ دوماہی پرواز ادب (پٹیالہ پنجاب)

7۔ ماہنامہ پرواز (لندن)

8۔ سہ ماہی فکر و تحقیق (دہلی)

9۔ سہ ماہی مباحثہ (پٹنہ)

10۔ سہ ماہی قرطاس (ناگپور)

11۔ سہ ماہی اصناف ادب (بہار)

12۔ ماہنامہ نگینہ (کشمیر)

13۔ سہ ماہی انتساب (مدھیہ پردیش)

14۔ سہ ماہی تحریک ادب (بنارس)

15۔ ماہنامہ جہاں نما (گنگوہ)

16۔ سہ ماہی افق ادب (جھارکھنڈ)

17۔ سہ ماہی کاوش (شاہجہان پور یوپی)

18۔ ماہنامہ رہنمائے تعلیم (دہلی)

19۔ سہ ماہی رنگ (دھنباد بہار)

20۔ ششماہی تسلسل (جموں یونیورسٹی)

21۔ سہ ماہی مژگاں (کلکتہ)

22۔ سالنامہ ترسیل (فاصلاتی نظام تعلیم کشمیر یونیورسٹی)

23۔ ماہنامہ زریں شعاعیں (بنگلور)

24۔ سہ ماہی بزم ادب (کشمیر)

25۔ سہ ماہی ابجد (بہار)

26۔ سہ ماہی لمحے لمحے (بدایوں یوپی)

27۔ ماہنامہ تریاق (ممبئی)

28۔ ماہنامہ شاندار (اعظم گڑھ)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے توسیعی لیکچر

1۔ 2011 میں لکھنو میں Mass communication society کے زیر اہتمام ''اردو زبان کی اہمیت وافادیت'' کے موضوع پہ لیکچر دیا اور ''باغی'' نام کی کہانی سنائی۔

2۔ کشمیر سینٹرل یونیورسٹی میں 2013ء میں ''آج کا اردو افسانہ'' کے موضوع پہ لیکچر دیا۔
3۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ادھم پور میں مئی 2014 میں ''اردو شعر و ادب میں تانیثیت'' کے موضوع پہ لیکچر دیا۔
4۔ اگست 2014ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین ادھم پور میں 'اردو افسانے کا تاریخی ارتقا اور اسکے فنی لوازمات' پہ لیکچر دیا۔
5۔ مئی 2015ء میں گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین گاندھی نگر جموں میں 'اردو ادب میں تانیثی رجحانات' پہ لیکچر دیا اور 'بیٹی' نام کی کہانی پڑھ کر سنائی۔
6۔ 8 جون سے 13 جون 2015ء تک سٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن جموں میں 'اردو ناول ایک تعارف'' ترقی پسند تحریک'' جدید اردو افسانہ' عصری معاشرہ اور اخلاقی اقدار کی اہمیت' اور اردو کا صوتیاتی نظام موضوعات پہ لیکچر دیئے۔
7۔ ریڈیو کشمیر جموں کے ادبی پروگرام 'خرمن' سے 26 سالہ وابستگی۔

نجی زندگی

1۔ علاقہ مرمت (ضلع ڈوڈہ) سے ماتلائی تحصیل چھنینی۔ضلع ادھم پور میں ہجرت 1981ء میں۔
2۔ ازدواجی زندگی میں داخلہ: 6/اکتوبر 1991ء میں۔
3۔ رفیقۂ حیات کا نام: راشدہ اختر (لیکچرار اردو (10+2)
4۔ اولاد: رضا الرحمان (بیٹا) الیکٹریکل انجینئرنگ میں زیر تربیت۔اور صبا کریم (بیٹی) دسویں جماعت میں زیر تعلیم۔
5۔ ضلع ادھم پور سے ضلع جموں میں اپنے آشیانے میں تاریخ رہائش 6/اپریل 2011ء
7۔ پتہ۔

Dr Mushtaq Ahmed wani
Lane No 3 House No. 7
Firdousabad Sunjwan Jammu Tawi
pincode No 180011
Mobile No. 09419336120
Email: drmushtaqahmedwani@gmail.com

●●●

ANDAR KI BATEIN
(Short Stories)
by
Dr. Mushtaq Ahmed Wani

مشتاق احمد وانی جتنا سچا مومن ہے اتنا ہی کھرا افسانہ نگار بھی ہے اس کی افسانوی کارگزاری صرف اس کے آبائی صوبے جموں کشمیر تک ہی محدود نہیں بلکہ ہندوستان بھر میں رسائل وجرائد کے وسیلے سے پھیلی ہوئی ہے! مشتاق کے ہاں کہانی پن شروع تا آخر موجود رہتا ہے جس کی وجہ سے قاری اُس کے افسانے کی روح تک پہنچ جاتا ہے! وہ مجرّد اور مبہم، استعاروں سے پرہیز کرتا ہے! اپنے قاری کو گنجلک اور بے کیف پہیلیاں نہیں بجھاتا! مشتاق وانی صرف اُنہیں موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جن کا علاقہ ہماری زمین اور انسانی زندگی سے استوار ہوتا ہے! زندگی کے مختلف شعبہ جات میں برپا سیاسی و معاشی بدعنوانیوں کے زہر کو وانی قطرہ قطرہ اپنے روح وقلب میں اتارتا ہے! جب موضوع اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اُس پر روشن ہو جاتا ہے تب اس کی افسانوی ادائیگی کے لئے وہ اسلوب اور الفاظ تلاشتا ہے! وانی کے افسانوں میں عام آدمی کے خوں چکاں تجربات و مشاہدات اس طور اجاگر ہوتے ہیں جیسے وانی نے ان کو اپنے حسّاس وجود پر خود بھوگا ہوا ہو!! مشتاق وانی کے افسانوں کا اختتامیہ ایک خوبصورت نظم ایک خوبصورت شعر کی طرح ہمیں چونکاتا ہے اور اس کا افسانہ تادیر وجدان میں محفوظ رہتا ہے۔

پروین کمار اشک
Mob. 09855653990

معاصر اُردو ادب میں مشتاق وانی ایک مانوس قلم کار کا نام ہے۔ تخلیق، تحقیق اور تنقید کو یکساں طور پر ایک معیار کے ساتھ برتنا آسان نہیں۔ لیکن مشتاق وانی ایسا کر گزرتے ہیں۔ اس سے اُن کی ہمہ جہت ادبی شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے اُن کی مفصّل تصنیف اُن کے وسیع وعمیق مبلغ علم کا تازہ ثبوت ہے۔ فکشن کی تنقید اُن کی تنقیدی سرگرمیوں کا نمایاں پہلو تو ہے ہی، لیکن ساتھ ہی ایک منفرد فکشن نگار کی حیثیت سے بھی مشتاق وانی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ اُن کے کئی افسانے ہیں جو انہیں معاصر افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں جگہ دلوانے کی ضمانت ہیں۔ لیکن ان کا افسانہ ''اندر کی باتیں'' کئی اعتبار سے ایک عمدہ مابعد جدید افسانہ کہلانے کا سزاوار ثابت ہوتا ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید
Mob. 09419010472

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-707-1